قرآن، حدیث و سنّت اور اسلافِ اُمّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:19 Issue:7 July 2026

مُدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.ashrafululoomhyd.com

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع و اشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ



درسِ قرآن

صحابہؓ کی عظمت وحجیت پر خدائی مہر

از: مولانا شیخ عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرۃ:۱۳۷)

ترجمہ: اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہِ راست پر آجائیں گے اور اگر یہ منھ موڑ لیں تو درحقیقت وہ دشمنی میں پڑ گئے ہیں، اب اللہ تمہاری حمایت میں عن قریب ان سے نمٹ لے گا، اور وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔

تشریح: سورۂ بقرہ کی ابتدا سے اس آیت تک منافقین، یہود ونصاریٰ، کفار ومشرکین کے عقائد ونظریات، مکروفریب کا تذکرہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل مذکور ہے اور اسی ضمن میں ایمان باللہ وبالرسول کی تعریف بھی اجمال واختصار کے ساتھ اور کہیں بالتفصیل ذکر کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا آیت نازل فرماکر اللہ تعالیٰ نے ایمان کی ایسی جامع ومانع تعریف فرمادی جو تمام تعریفوں پر حاوی اور جملہ تاویلوں کے لیے شافی ہے دراصل وہ تعریف ہی نہیں بلکہ معیار اور کسوٹی ہے یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ یہ ایمان کی تعریف عظمتِ صحابہؓ وحجیتِ صحابہؓ پر خدائی مہر ہے، اعتقادات میں، اعمال میں، افکار ونظریات میں، تشریحات وتفہیمات میں، تفسیرات وتاویلات میں ماخذ ومرجع صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ نفوس قدوسیہ ہیں جو ان سے سرمو انحراف کرے گا وہ دین میں غیر معتبر اور عنداللہ غیر مقبول ہوگا۔

آیات میں بیان کی گئی ایمانی کسوٹی ہی گمراہ فرقوں کے درمیان سے حق کو واضح کرنے والی اور تمام ادیان باطلہ میں سے دینِ حق کو مبرہن کرنے والی ہے۔

---

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر، حیدرآباد

الغرض یہ تعریف افراط وتفریط کے درمیان راہ اعتدال دکھانے والی ہے حق تعالیٰ کی طرف سے جماعت صحابہؓ کا حسن انتخاب جہاں خود فضیلت کا حامل ہے وہیں پر تبین قرآن کے لیے مخاطب اول بنانا بھی ایک عظیم سعادت ہے، اس اعتبار سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام امور دینیہ میں لائق تقلید وقابل حجت ٹھہرے ہیں، تفسیر قرآن وتفہیم دین میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واسطے کو نظر انداز کرنا یا ان میں سے کسی کی تنقیص کرنا دین کا منبع وسرچشمہ یعنی قرآن وحدیث ہی کو بے حیثیت ماننا ہے، صحابہ کرامؓ کی ذات کو کیسے نشانہ بنایا جا سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ خود ان کے تدین اوران کے ورع وتقویٰ کی گواہی دے رہا ہے،، اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دل میں ایمان کی اور تمہارے قلوب میں اس کو مزین کر دیا اور تمہارے دل میں نفرت ڈال دی کفر، گناہ اور نافرمانی کی اور وہی لوگ نیک ہیں'' (الحجرات) اس مقدس جماعت سے ناراضی کیسے؟ جب کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنی جانب سے پروانہ رضا عطا فرمایا ہے: ''اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے'' (التوبہ)

وہ زبان گنگ کیوں نہیں ہو جاتی؟ اور وہ قلم ٹوٹ کیوں نہیں جاتے؟ جو شان صحابہ میں گستاخی کرتے ہیں جبکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نبی کو اور ان کے ساتھ والے مومنین کو رسوا نہیں کرے گا'' (التحریم) ان پاکباز جماعت صحابہؓ میں خامی اور خرابی کیسے نکالی جا سکتی ہے؟ جبکہ حق تعالیٰ نے ان سے بھلائی کا وعدہ کیا ہوا ہے: ''اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا'' (الحدید) جو لوگ صحابہ کرامؓ کے سلسلے میں ہرزہ سرائی کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے کیوں نہیں ڈرتے؟ جبکہ نبی پاک ﷺ نے ان کو آگاہ کیا ہے: ''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے معاملے میں'' (ترمذی) جو لوگ صحابہ کرامؓ کے ساتھ دریدہ دہنی کا معاملہ کرتے ہیں ان ملعونوں کو پڑھنا چاہیے کہ نبی پاک ﷺ نے ان کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا: ''جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو برا کہتے ہیں تو تم ان سے کہو: خدا کی لعنت ہے تمہارے شر پر'' (ترمذی)

اپنے زور بیانی کے دم پر، وفور علم کے غرہ میں، کمال نگارشات کے فخر میں صحابہؓ کی مقدس، پاکباز، مونس و غم خوار، جانثار وجانباز جماعت کو تنقید کا نشانہ بنانا بڑی محرومی اور دنیاوی واخروی خسران عظیم کی بات ہے۔

اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے اور دفاع صحابہؓ کے لیے ہمیں قبول فرمالیں تو یہ ہمارے لیے سعادت عظمیٰ کی بات ہوگی۔ آمین



درسِ حدیث

شہادت مقامِ فضیلت ہے نہ کہ مقامِ سوگ

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ انسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَا مِن أحَدٍ يَدخُلُ الجَنَّةَ يُحِبُّ أن يَرجِعَ إلى الدُّنيا، وأنَّ لَهُ مَا عَلَى الأَرْضِ مِن شيءٍ، غَيرُ الشَّهيدِ، فإنَّه يَتَمَنَّى أن يَرجِعَ، فيُقتَلَ عَشرَ مَرَّاتٍ، لِما يَرى مِنَ الكَرامةِ. (بخاری شریف: 2817)

ترجمہ:۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت میں داخل ہونے والا کوئی شخص یہ نہیں چاہے گا کہ وہ دنیا میں واپس لوٹ کر جائے، اور جنت کی بے حساب و بے نظیر نعمتوں کے مقابلے میں اس کو دنیا بھر کی نعمتیں حاصل ہوں سوائے شہید کے، شہید یہ آرزو اور تمنا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں واپس جائے، اور دس بار راہِ خدا میں شہادت کا مقام حاصل کرے؛ کیوں کہ وہ شہادت کی عظمت و کرامت کو جانتا ہے، جو اسے من جانب اللہ عطا ہوئی ہے۔

تشریح:۔اسلامی تعلیمات و ہدایات کی روشنی میں ''شہادت'' ایک قابلِ رشک و فخر مقامِ سعادت ہے، اور ''شہید فی سبیل اللہ'' عالمِ برزخ اور آخرت میں صاحبِ فضائل شخص ہے، قرآن و حدیث کے بے شمار نصوص اس بات پر شاہد اور گواہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر شہادت کی تمنا اور آرزو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے؛ میری تو آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، **وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوَدِدتُّ اَنْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، ثُمَّ أُحيَا، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ أُحيَا، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ أُحيَا، ثُمَّ اُقْتَلُ** (بخاری: 2787) ایسا ہی جذبہ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا، آپؓ باضابطہ اللہ تعالیٰ کے حضور شہادت فی سبیل اللہ کی دعا مانگتے تھے؛ اے اللہ! مجھے اپنے راستہ کی شہادت عطا کر، اور میری موت اپنے

---

* استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

رسول کے شہر میں مقدر فرما، اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُوْلِكَ (بخاری: 1890) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں زبانِ نبوت نے سیف اللہ کا لقب دیا، آپؓ نے زندگی تمام اسلامی جنگوں میں سے سپہ سالارِ اعظم اور جانباز مجاہد کے طور پر عظیم مخلصانہ خدمات انجام دیں؛ جب بسترِ مرگ پر تھے، محزون غمگین نظر آئے، ساتھ والوں نے تسلی و اطمینان دلایا، تو بادیدہ نم اسی حسرت کا اظہار کیا، فرمانے لگے؛ میں نے جنگی میدانوں میں اتنے گھمسان کے معرکے سر کیے، اور تیر تلوار اور نیزے کا کوئی حملہ ایسا نہیں جس نے میرے جسم کے کسی حصے کو متاثر نہ کیا ہو، اور جس کا زخم ونشان میرے جسم پر نہ ہو؛ لیکن آج میں بستر پر ایسے مر رہا ہوں جیسے کوئی بزدل اور اونٹ مرتا ہے (البدایہ النہایہ) یہ تو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند مثالیں ہیں؛ ورنہ ہر صحابیِ رسول اور ولی مقبول کا دل اسی جذبہ سے سرشار اور معمور نظر آئے گا، اس سے معلوم ہوا کہ شہادت فی سبیل اللہ کا میسر آجانا کوئی غم واندوہ اور سوگ و ماتم کا مرحلہ نہیں ہوتا؛ بلکہ حق تعالیٰ کے شکر وامتنان اور فرحت ومسرت کا وقت ہوتا ہے، فَرِحِيْنَ بِمَآ آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ الخ۔

زیرِ نظر حدیث شریف میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی حقیقت کو دل نشین و دل پذیر تعبیر میں بیان فرما رہے ہیں؛ کہ اگر کسی خوش نصیب کو جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے تو وہ دنیا کی ساری نعمتوں کے بدلے میں بھی جنت سے واپس آنے کو تیار نہیں ہوگا؛ لیکن اللہ کے راستہ میں شہید ہونے والا تمنا کرے گا کہ ایسے دسیوں دفعہ اسے شہادت نصیب ہو، ہر دفعہ قتل کیا جائے، پھر زندہ ہو، اور راہِ خدا میں جہاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرے، اس کا یہ جذبہ دراصل اس کے اُخروی مقام ومرتبہ اور عزت وشرافت کو دیکھ لینے کی وجہ سے ہے جو اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھا ہے، پھر چوں کہ شہادت کا موقعہ ہر ایک کے لیے نصیب ہونا مشکل ہے، اس لیے اس کی طلب رکھنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے درجہ پر پہنچا تا ہے، اگر چہ وہ بستر پر مرے، مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ، بَلَغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ، وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ۔ (مسلم: 1909)

بہر حال! شہادت کو ایک عظیم منصب اور وقیع مرتبہ سمجھنے کے بجائے شہید کے حق میں شہادت کے مہینہ دن یا وقت کو غم اور سوگ کے طور پر سمجھنا اور منانا اسلامی عقیدہ کے خلاف اور نصوصِ صریحہ کے انکار کے مترادف ہے، سلامتیٔ فکر عقیدہ کے حوالے سے اس قسم کے تصورات سے اجتناب ہر مسلمان ضروری ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو فہمِ صحیح اور فکرِ سلیم اور تمنائے شہادت ورُتبۂ شہادت عطا فرمائے۔ آمین

پیش گفتار

شادی کا اسلامی تصور[۱]

از: مدیر*

جب لڑکے اور لڑکی کا انتخاب اسلامی تعلیمات اور نبوی ہدایات کے مطابق ایمان اخلاق کو بنیاد بنا کر کرلیا گیا تو اب ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں باقاعدہ منسلک کردینے کی کاروائی باقی رہ جاتی ہے، لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں جس طرح رشتوں کے انتخاب میں غلو و بے اعتدالی حد سے تجاوز کرگئی ہے اسی طرح نکاح کی تکمیل بھی افسوسناک حد تک ظلم وزیادتی اور اسراف وفضول خرچی کی بدترین مثال بن گئی ہے، بلکہ اس میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام نے ہمیں کوئی طریقہ کار اور راہِ عمل نہ بتلائی ہو، کیوں کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشتے ڈھونڈھنے کا اسلامی طریقہ سکھلایا ہے اسی طرح ان کی تکمیل کی آسان و باوقار صورت سے بھی امت کو آگاہ فرمایا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ — یقینا بابرکت نکاح وہی ہے جو کم سے کم مصارف میں ہوا ہو۔ (مشکوٰۃ: ۲/ ۲۰۱۹)

ملا علی قاریؒ اس حدیث کے ذیل میں وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ایسرہ مؤنۃ سے مقدار مہر و مصارف نکاح میں تقلیل اور سہولت مراد ہے تاکہ امت کو عملی طور پر اس دولت قناعت کی طرف توجہ ہوجائے جو نہ کبھی گھٹتی ہے اور نہ کبھی ختم ہوتی ہے، جبکہ قناعت کے علاوہ کوئی دولت پائیدار و سکون بخش نہیں سب فنا پذیر ہیں۔ (مرقاۃ ج:۶ ص: ۱۹۴)

---

[۱] یہ مضمون مدیر محترم کی نہایت اہم کتاب ''شادی کا اسلامی تصور اور ہمارا طرزِ عمل'' سے ماخوذ ہے۔ بعض عامۃ المسلمین کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے دوبارہ شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ مرتب

یہ ہدایت صرف امت ہی کے لیے نہ تھی، خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اپنا عمل بھی اسی ہدایت کے موافق تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی چار بیٹیوں کی شادیاں کیں، خود اپنے لئے متعدد نکاح فرمائے، ان سب کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت سادگی کے ساتھ اس طرح انجام پائے کہ ایک جھونپڑی میں رہنے والا غریب بھی اس پر بلا کسی مشقت کے عمل پیرا ہو سکتا ہے، آپ چاہیں تو سیرت کی کتابوں میں ازواجِ مطہرات اور بناتِ طاہرات کی شادیوں کے واقعات پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں آپ کی سہولت کے لیے اسی رسالہ میں مضمون نمبر (۸) کے تحت حضرت فاطمہؓ کے نکاح علاوہ اور بھی اور چند مثالی واقعات بیان کئے جا رہے ہیں۔

اسی اسوۂ حسنہ اور مبارک نمونہ کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے معاشرہ میں اور ان کے بعد بھی ایک عرصہ تک شادی سادی ہوا کرتی تھی، اس کے لئے مہینوں بلکہ برسوں پہلے سے متفکر ہونا نہیں پڑتا تھا، بڑے بڑے شادی خانے بُک کرانے کی ضرورت تھی نہ قیمتی قیمتی رقعے چھپانے کی حاجت، نہ جہیز کا مسئلہ نہ جوڑے کا جھگڑا! واقعہ یہ ہے کہ نکاح بھی دوسرے حوائج بشریہ کی طرح ایک طبعی وفطری ضرورت ہے جس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال وآسان طریقہ کار کا ہمیں پابند فرمایا ہے، اس کے لیے ایک ہنگامہ برپا کرنے اور ہوس وحرص کا ہوّا کھڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مشہور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں:

''اسلام میں نکاح کا طریقہ اور شادی کی تقریب بہت سادہ اور مختصر ہے اس کو زندگی کا ایک فریضہ، ایک فطری تقاضہ اور ایک عبادت کی حیثیت سے ادا کیا جاتا ہے، صرف ایجاب وقبول کے دو لفظ اور دو گواہ اس کے لئے کافی ہیں، اس کا مقصد یہ ضمانت ہے کہ یہ تعلق مجرمانہ اور رازدارانہ طریقہ پر اور چوری چھپے نہیں ہے، اسی لئے کسی قدر اعلان اور تشہیر کے ساتھ اس کا ہونا ضروری ہے؛ اسلام کی تاریخ میں اس کی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ حضورؐ کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کم اور آبادی مختصر ہونے کے باوجود بعض ایسے صحابہ کرامؓ نے مدینہ میں اپنی شادی کی جن کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نہایت گہرے اور خاندانی تعلقات تھے اس کے باوجود خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم —— جن کی شرکت موجبِ عزت بھی تھی اور باعثِ برکت بھی —— کی محفلِ نکاح میں شرکت کی دعوت کو انہوں نے ضروری نہ سمجھا''۔ (ہندوستانی مسلمان)

الغرض! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ''بابرکت نکاح وہی ہے جس میں خرچہ کم ہو'' بتلا رہا ہے کہ اسلام میں نکاح کے لیے سادگی اور کم خرچی مطلوب ہے، اور ہمارے معاشرہ میں جاری موجودہ تصورِ نکاح اسلامی تصورِ نکاح کے بالکل خلاف ہے۔

نکاح کا جاہلی تصور

نکاح کے جاہلی تصور کا نقشہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے ایک جگہ اس طرح کھینچا ہے

''اس وقت دنیائے اسلام میں اور خاص طور پر ہندوستان میں شادی ایک بڑی پیچیدہ اور طویل رسم ،نہایت پُرمصارف کام اور شان وشوکت اور خاندان کی مالی وشہری حیثیت کے اظہار کا ذریعہ بن گئی ہے،اور بعض حالات میں تو وہ ایک سخت مصیبت و پریشانی اور زیرباری کا ذریعہ اور دردِ سر بن کر رہ گئی ہے؛اچھے اچھے دیندار اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں اب بھی شادیاں بڑی دھوم دھام،تزک واحتشام سے کی جاتی ہیں،محفلِ نکاح میں بڑی شان وشوکت کا اظہار اور زینت وآراستگی کی جاتی ہے اس سلسلہ میں شان وشوکت اور اپنے تعلقات کی وسعت کے اظہار کے لئے بہت سے ایسے نئے طریقے متعارف ہوئے ہیں جو پہلے مروج نہیں تھے،اور بہت جگہ مصارف ہزاروں سے تجاوز ہوکر لاکھوں کی رقم تک پہونچ جاتے ہیں جن لوگوں کے پاس رقم نہیں ہوتی وہ اس کے لئے قرض اور بعض وقت بلکہ اکثر وقت سودی قرض لیتے ہیں نام ونمود فخر وتعلّی اور مسابقت کے جذبات بھی اس میں خوب کام کرتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی شادیوں میں کچھ (بلکہ بہت کچھ) اجزاء مقامی ہیں جو یہیں کے مسلمانوں کی خصوصیت بن گئے ہیں،دوسرے ملکوں کے مسلمان ان سے آشنا بھی نہیں مثلاً لڑکے کی طرف سے فرمائش اور مطالبات ہوتے ہیں جن کا پورا کرنا لڑکی والے کے لئے ضروری ہوتا ہے،کیا اس کا کوئی اخلاقی جواز ہوسکتا ہے؟ یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں کہ اس سے اب لڑکیوں کو مناسب جوڑا ملنے اور ان کے والدین کے لئے اپنے فرض سے سبکدوش ہونے میں کیسی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں اور انہوں نے زندگی کو کتنا تلخ اور شادی کو کیسا عذاب بنادیا ہے اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے دعوت کا رواج جو ایک اچھا خاصہ ولیمہ معلوم ہوتا ہے،اس کے علاوہ بیسیوں رسمیں ایسی ہیں جو ہندوستانی خاندانوں میں ابھی تک مروج ہیں،ان سطروں کے لکھتے وقت یہ افسوسناک خبر اخباروں میں پڑھنے میں آئی ہے کہ ریاستِ بہار کے ایک مسلمان مارکٹنگ آفیسر نے اس بناء پر خودکشی کرلی کہ وہ اپنی چار بیٹیوں کے لئے لڑکے والوں کے مطلوبہ جہیز کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر تھے۔اس معتبر اخبار کے بیان کے مطابق صرف دہلی میں اب جہیز کے لئے ہر بارہ گھنٹے میں ایک دلہن کو جلاکر مارڈالا جاتا ہے''

(ہندوستانی مسلمان ص:۵۳ملخصاً)

محدثِ وقت علامہ کشمیریؒ جمعیۃ علماء ہند کے خطبۂ صدارت میں اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’ہماری بدقسمتی کی داستان طویل ہے، ہم نے خود اپنے ہاتھوں شادیوں کو اپنے لئے پھانسی کا تختہ بنا رکھا ہے، اسراف وفضول خرچی کی انتہا ہے، برادری میں ناک کٹ جانے کے اندیشہ سے سودی قرض لے کر تباہی وبربادی کو دعوت دی جاتی ہے، میں خود بہت سی ایسی مثالیں جانتا ہوں، بڑے بڑے صاحبِ جائداد وثروت نے اپنی اولاد کی شادی کر کے خود کو نانِ شبینہ کا محتاج بنالیا ہے، اور پھر ان کی عمر ساری ہلاکت وتباہی میں گذری، حالانکہ فضول خرچی کو قرآن مجید نے اپنے بے لاگ انداز میں کارِ شیطان قرار دیا ہے‘‘۔(نقش دوام ص:۲۳۶)

سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نکاح کو اس قدر آسان بنایا تھا کہ اس کی برکت سے زنا جیسی بے حیائی کا وجود معاشرہ سے ختم ہوگیا تھا، اب ہم نے نکاح کو اس درجہ مشکل بنادیا ہے کہ معاشرہ میں زنا آسان بلکہ عام ہوگیا اور ہوتا جارہا ہے۔ ان بے جا رسومات کی پابندی نے اس قدر مجبور کردیا ہے کہ اگر ان رسومات ومطالبات کو پورا کرنے کی کسی میں سکت نہیں ہے تو وہ یا تو غیر اخلاقی حرکتوں اور شرمناک افعال کا مرتکب ہوجائے یا پھر خودکشی کا راستہ اختیار کرلے۔ چنانچہ امت کے کتنے شریف وعفیف گھرانے ایسے ہیں جن کی بیٹیاں سماج کے دولت مندوں کی پیدا کردہ ان بے ہودہ رسومات اور نوجوانوں اور ان کے سرپرستوں کے جارحانہ مطالبات سے عاجز آکر اپنی عزت وعصمت کو نیلام کررہی ہیں یا پھر خودکشی اور خود سوزی جیسے انتہائی خطرناک اقدام کی مرتکب بن رہی ہیں؛ آئے دن اخبارات اس قسم کے شرمناک واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔(نقش دوام)

اس کی وجہ وہی ہے کہ کبھی نکاح چند دراہم میں بآسانی ہوجاتا تھا اور اب سیکڑوں نہیں ہزاروں میں بھی ہونا مشکل ہے، فریقین کی بڑھتی ہوئی ہوس پرستی ودنیا طلبی کا حال یہ ہے کہ لڑکی دیکھی اور پسند بھی آگئی مگر اس کے بعد کئی کئی ہفتے اور مہینے ان مسائل کے حل کرنے میں نکل جاتے ہیں کہ کتنے آدمیوں کو دعوت دیں گے؟ کیا کھلائیں گے؟ کہاں کھلائیں گے؟ جہیز کیا دیں گے؟ جوڑے کے نام سے بھیک کتنی دیں گے؟ لڑکی کے گلے میں کتنا زیور پہنائیں گے؟ نوشہ کی کار پر پھول کتنے ہوں گے؟ خدا جانے کتنی آفتیں اور مصیبتیں ہیں؛ حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ غیر ضروری مسائل اور ظالمانہ مطالبات قطع نسبت یعنی رشتے کے ختم ہوجانے اور ٹوٹ جانے کا سبب تک بن جاتے ہیں، حالانکہ نکاح کے سلسلہ میں ان مسائل اور مطالبات کی نہ شرع شریف میں کوئی اہمیت ہے نہ عقل سلیم کے نزدیک کوئی مقام ہے۔ اس کے باوجود ان غیر شرعی اور غیر عقلی حرکتوں کو لوازماتِ نکاح میں زبردستی شامل کر کے لڑکے والوں نے ایک طرف شادی بیاہ کے مسئلہ کو گمبھیر اور گرانبار مسئلہ بنادیا، تو دوسری جانب خود کو سوال کی ذلت میں اور لڑکی والوں کو اسراف کی حرمت میں مبتلا کردیا ہے۔

جہیز کی حقیقت اور اس میں غلو کے نقصانات

ادھر لڑکی والے بھی جہیز کے نام پر غیر ضروری اخراجات اور اسراف وتبذیر کا مظاہرہ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، کچھ تو خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر، کچھ حیثیتِ عرفی کے جھوٹے اظہار کے لئے اور کچھ برادری وبستی میں شہرت وافتخار کی خاطر! اسی طرح کبھی مطالبات کے دباؤ میں آ کر۔

چنانچہ غرباء میں جہیز کے اندر بے شمار وبے ضرورت اشیاء کی خاندان کے رواج کے مطابق تکمیل کو ضروری سمجھا جاتا ہے خواہ وہ کتنے ہی گھٹیا اور گئے گذرے معیار کے کیوں نہ ہوں اور امراء میں ان اشیاء کے معیارات میں تقابل وتفاخر پر نظر رکھی جاتی ہے، ان کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے اور یہ سب چیزیں جن کی اس وقت کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی اسی موقعہ پر جمع کرنے اور دینے کو ضروری سمجھا جاتا ہے خواہ اس کے لئے قرض تک لینے کی نوبت آ جائے۔

حالانکہ جہیز —— جو عربی زبان کا لفظ ہے اور جس کے معنی تیاری کرنے کے ہیں اسی لفظ سے میت کی تیاری کو بھی تجہیز کہتے ہیں —— کی حقیقت بس اس قدر ہے کہ زوجین کو ایک دوسرے سے استمتاع کے لیے اور زندگی بسر کرنے کے لیے بقدر ضرورت سامان فراہم کر دیا جائے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زیر کفالت چچازاد بھائی سیدنا حضرت علیؓ اور اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہؓ کی ازدواجی زندگی کے لیے اشیاء ضروریہ فراہم فرمادی تھیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ حضرت علیؓ کے اس ارشاد:

جهز رسول الله ﷺ فاطمة فى خميل وقربة ووسادة حشوها اذخر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز کے طور پر ایک پلودار چادر اور ایک مشکیزہ ایک گھاس بھرا ہوا تکیہ دیا تھا-

کے تحت فرماتے ہیں کہ حدیث کے لفظ ''جهز'' کے معنی اصطلاحی جہیز دینے کے نہیں بلکہ ضروریات کا انتظام اور بندوبست کرنے کے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں کا انتظام حضرت علیؓ کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے انہی کی طرف سے اور انہی کے پیسوں سے کیا تھا، کیونکہ یہ ضروری چیزیں بھی ان کے گھر میں نہیں تھیں۔ (معارف الحدیث: ۷/ ۳۰)

کیا آج نکاح کرنے والا نوجوان بھی ایسی ہی جز معاشی میں مبتلا ہوتا ہے کہ شب بسری کے لیے ایک

بچھونے اور گھر گرہستی کیلے ایک مشکیزہ اور مٹکے سے بھی محروم ہو، ہرگز نہیں! اس لیے کہ آج جب تک لڑکا معاشی اعتبار سے خود مکتفی نہیں ہوجاتا تب تک نہ ماں باپ اس کی شادی کے لیے تیار ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی اسکو بیٹی دینے کے لیے راضی ہوتا ہے، جب ایسی بات ہے تو اس کو اپنی بیوی کی ضروریات زندگی کے لیے خود ہی انتظام کرنا چاہئے، حق تعالیٰ نے اسی وجہ سے تو اس کا مرتبہ عورت پر بڑھا کر اسے فوقیت وفضیلت دی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۤءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (سورۃ النساء: ۳۴)

مرد لوگ عورتوں پر حاکم اسوجہ سے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی (تخلیقی طور پر) بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد لوگ اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں۔

اس فطری نظام کے برخلاف عورت مرد پر اپنا مال خرچ کرے گی تو قوامیت اور فوقیت کی حقدار عورت ہوجائے گی، چنانچہ ایسے گھروں میں عملاً یہی ہورہا ہے، جو مردوں کے لیے انتہائی شرم ناک اور افسوسناک صورتحال ہے۔

لا حول ولا قوہ کیا الٹا زمانہ ہے
عورت تو ہے مردانہ اور مرد زنانہ

بہرحال! پہلے تو یہی بات طئے نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ ہلکا پُھلکا سامان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر بھیجا تھا وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جہیز تھا یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اسبابِ زندگی کی فراہمی تھی، اور اگر بالفرض اسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جہیز مان کر اس کا جواز اور گنجائش نکال بھی لی جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ اس قدر گنجائش نکل سکتی ہے کہ زوجین کو نکاح کے وقت فوری طور پر پیش آنے والی اور سخت ناگزیر ضرورت کی اشیاء فراہم کردی جائیں، نہ کہ موجودہ رواج کے مطابق بےضرورت و بےمصرف اسباب کا ڈھیر لگا دیا جائے، مروجہ جہیز میں بعض سامان تو ایسے ہوتے ہیں کہ برسوں نہ ان کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ان سے کوئی فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان کے دینے سے بس رسم کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور لڑکی کے ولی کے پاس کوئی تنگی نہیں ہے تب بھی عقلمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ جہیز اور دعوت کے مصارف کو ضرورت کے درجہ تک محدود کرکے اس بچے ہوئے پیسے سے اپنی لڑکی کے حق میں مفید وکارآمد چیز فراہم کرنے کی صورت نکالی جائے یا کسی اور غریب لڑکی کے لیے اس پیسے سے سامانِ ضرورت مہیا کردیا جائے، ذرا غور کرنے سے خود خاندان بلکہ خونی رشتوں میں ایسے کئی ضرورتمند مواقع نکل آئیں گے، مگر

جب عقلوں پر ہوا وہوس اور غرور ونخوت کے پردے پڑ جاتے ہیں تو عقلمندی کے کاموں کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔

دعوتوں کا خواہ مخواہ بوجھ

جہیز کے سامان کے علاوہ دعوتوں کی شان بھی اب مستقل روگ بن گئی ہے، سینکڑوں لوگوں کی دعوت اور لاکھوں کا خرچ معمول کی چیز بن گئی ہے، شادی خانوں کے انتخاب سے لے کر کھانوں کی انواع واقسام تک، اسی طرح دعوت ناموں کی نوعیت سے لے کر شہ نشین کی زینت تک بیسیوں مراحل ہیں، اور ہر مرحلہ میں حیثیتِ عرفی اور عزتِ شخصی اس طرح گروی ہے کہ اگر اسراف وتبذیر کے شیطانی ہتھکنڈے اور فضول خرچیوں کے نفسانی تقاضے پورے نہ کر لئے جائیں تو گویا یہ شخص اب انسانوں کی صف سے نکل کر جانوروں کے زمرہ میں شامل ہوجائے گا، افسوس! کس خبط اور حماقت میں مسلمان مبتلا ہوگئے۔

مختصر یہ کہ شادی بیاہ کے ساتھ جوڑی گئی تمام ہندوانی رسمیں اور شیطانی مطالبات محض فضول خرچی اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتِ مال کا ناجائز استعمال ہے، اور فضول خرچی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سخت ناپسندیدہ صفت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (سورالانعام:۱۴۲)

اسراف مت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (سورۂ بنی اسرائیل:۲۷)

بیشک فضول خرچی کرنیوالے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے۔

ولیمہ کا اسلامی معیار اور مروجہ تصور

شر الطعام طعام الوليمة يدعىٰ لها الاغنياء ويترك الفقراء الخ (صحیح البخاری:۳/۳۲)

ایسا ولیمہ بہت برا ہے جس میں دولتمندوں کو مدعو کیا گیا ہو مگر غرباء و ضرورتمندوں کو محروم رکھا گیا ہو۔

غرباء پروری وفقراء نوازی کا اتنا اہتمام کہ جس دعوت میں انہیں نظر انداز کیا گیا ہو اس دعوت ہی کو ناپسند

قرار دیدیا جائے ، کیا دنیا کے کسی مذہب وملت میں نظر آسکتا ہے؟ اس کے باوجود آپ ﷺ کی یہ تعلیم اس زمانے میں مسلمانوں کی بے التفاتی اور بے توجہی کی شکار ہوگئی ،آج کیسے کیسے شاندار ولیمے ہوتے ہیں ،ان میں کیسے کیسے ٹھاٹ باٹ کے لوگوں کی چلت پھرت آپ نے دیکھی ہوگی ،مگر کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ جس طرح موٹر نشینوں اورسوٹ بوٹ میں ملبوس دعوتیوں کا استقبال ہوتا ہے اسی طرح کچھ غرباء وفقراء کی بھی اسی انداز سے یہ سمجھ کرعزت کی جارہی ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے سفارشی مہمان ہیں؟ان کا اکرام واعزاز تو کیا ہوتا سیدھی نظر سے دیکھنا بھی ہماری شان کے خلاف ہے، بلکہ اب تو ان کی شرکت اپنی عزت کے خلاف سمجھی جاتی ہے،قریبی وخونی رشتہ دار بھی اگر بدقسمتی سے مفلسی ومحتاجی کا شکار ہے تو اس سے اپنی رشتہ داری بتلاتے ہوئے بھی ایک قسم کی عارمحسوس کی جاتی ہے فیا للاسف!

یہ تو دعوتوں میں نبی کی سفارش کے باوجود غرباء کونظرانداز کرنے کی بات تھی ،اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ولیمے کی دعوتیں بے جا تکلفات اوراسراف وتبذیر میں مسابقت یعنی کامپٹیشن کا میدان بن گئی ہیں کئی کئی اقسام کے کھانے اورنت نئے قسم کے انداز دن بہ دن بڑھتے جارہے ہیں، ماکولات(کھانے پینے کی چیزوں) کا ضیاع الگ ہورہا ہے، دعوتوں میں بے پردگی وبے حیائی تو عام ہی تھی موسیقی ،آرکسٹرا،محافلِ مشاعرہ ولطیفہ اوررقص وسرودوغیرہ مزید برآں ہوگئی ہیں۔

ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ نکاح ایک سنت ہے، ظاہر ہے کہ اگر یہ طریق سنت پر ہوگا تو باعثِ برکت وموجبِ رحمت ہوگا اور اگر من مانے طریقوں پر ہوگا تو لائقِ رسوائی وذلت ہوگا ،اس کے باوجود ہم اپنا طرزِعمل بھی دیکھ لیں کہ ایک سنت کے نام پر کتنے فرائض ترک ہورہے ہیں، کتنے احکام مٹ رہے ہیں ،نمازوں کی کیا گت بن رہی ہے، بے پردگی وبے حجابی کا کیا عالم رہتا ہے،لڑکیوں اورلڑکوں کا کیسا اختلاط ہوتا ہے، دل لگی ، ودل بستگی کا ایک فلک شگاف شور برپا ہوجاتا ہے، اسراف وفضول خرچی انتہاء کوپہنچ جاتی ہے، ان حرکتوں سے سوائے اس کے کیا حاصل ہوتا ہے کہ ایک طرف ہم خداوند تعالیٰ کی خفگی وناراضگی کے شکار ہوجاتے ہیں تو دوسری جانب دیکھنے والے غیر مسلم اسلام سے مانوس ہونے کے بجائے اوردور ہوجاتے ہیں۔ تیسری جانب ان خرافات وروایات کوشادی کا لازمی جزو بنادینے کی وجہ سے غریبوں کے نکاح مشکل ہوتے چلے جارہے ہیں اورسماج بے حیائی وبدکاری کے داغ دھبوں سے رسوا ہوتا جارہا ہے۔**فالی اللہ المشتکی**

بہتر ہے کہ نکاح مسجد میں ہو

جاہلیت میں نکاح کے چار طریقے رائج تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے ایک شریفانہ طریقہ ـــــ پیغام رسانی کے ذریعہ رشتہ اور مہر طئے کر کے علی الاعلان شادی کرنے کا ـــــ باقی رکھا، بقیہ تین غلط اور شرمناک طریقوں کو ختم فرما دیا، اور چونکہ اسلام سے پہلے چوری چھپے طریقے زیادہ چلتے تھے اس لئے اسلام نے نکاح کو علانیہ طور پر کرنے کی ترغیب دی اور اسے پسندیدہ قرار دیا، اس کے طریقے بھی بتلائے، انہی میں ایک طریقہ نکاح کا مسجد میں منعقد کرنا ہے، اس سے اہلِ محلہ میں خود بخود تشہیر ہوجاتی ہے، اور یہ اعلان کا آسان اور سستا طریقہ بھی ہے، نیز اس میں جگہ کی برکت اور منکرات سے حفاظت بھی ہے، ارشادِ نبوی ہے:

اعلنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوا عليه بالدفوف	نکاح کو علانیہ طریقے پر کیا کرو، ان کا انعقاد مسجد میں کرو، اور اعلان کے لیے دف بجایا کرو۔
(مشکوٰۃ۔کتاب النکاح)	

''دف'' اس زمانہ میں اہم کاموں کی خبر کا عام طریقہ تھا، بیانڈ باجا، آرکسٹرا وغیرہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اعلان وتنبیہ کا ذریعہ تھا، یہ رقص وسرود کا وسیلہ ہے جو کہ ناجائز ہے، اور اب دف کے ذریعہ اعلان کیا بھی نہیں جاتا، اس کی جگہ دعوت ناموں نے لے لی ہے؛ البتہ مسجد میں نکاح کرنے کے فوائد اب بھی قائم ہیں، بلکہ بہت سے منکرات وخرافات سے حفاظت کا سبب بھی ہے۔ (بشرطیکہ ان سے بچنا چاہیں) ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

''مسجد میں انعقاد کی ترغیب یا تو اعلان کی سہولت کے لیے ہے، یا پھر جگہ کے تقدس سے برکت حاصل کرنے کے واسطے ہے، بہتر ہے کہ وقت ـــــ یعنی شوال کا مہینہ، جمعہ کا دن، عصر کے بعد کا وقت ـــــ کی فضیلت کو بھی جگہ کی برکت کے ساتھ شامل کرلیا جائے تو پھر کیا کہنے؟ اس طرح یہ نکاح نورٌ علیٰ نور اور سرورٌ علیٰ سرور ہوجائے گا؛ نیز اس میں شرکاء کا اجتماع اور ثواب دونوں زیادہ ہوجائیں گے اور اعلان کی مصلحت بھی پوری ہوجائے گی۔'' (مرقاۃ المفاتیح: ۶/ ۲۸۵)

اس کے علاوہ تجربہ یہ ہے کہ مسجد میں مجلسِ نکاح منعقد کرنے سے بہت سے منکرات مثلاً تصویر کشی، ویڈیو گرافی، بے پردگی اور فضول گوئی وغیرہ سے حفاظت رہتی ہے، جس کی برکت سے ایک نئی زندگی کے آغاز اور ذمہ داریوں کے تبادلہ کا یہ معاہدہ خوب سے خوب تر اور بابرکت ہوجاتا ہے، مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ مسجد میں

نکاح پر اکتفاء کر کے بقیہ رسوماتِ متعلقہ سے احتراز کیا جائے؛ جب کہ ایسا کم ہو رہا ہے، اکثر لوگ دیندار اعزہ واحباب کو خوش کرنے کے لیے محفلِ نکاح تو مسجد میں منعقد کر رہے ہیں اور بے دین وآزاد دوستوں کو راضی رکھنے کے لیے شادی خانوں میں پہونچ کر ان تمام خرافات کی تکمیل کر رہے ہیں جن سے بچنے کے لیے مسجد میں نکاح کیا گیا تھا، اسی طرح متمول طبقہ میں مسجد کا انتخاب بھی شادی خانوں کے انتخاب کی طرح عزت وحیثیت کا مسئلہ بن گیا ہے، قرب وجوار کی مسجدیں چھوڑ کر دور دراز کی شاندار اور بڑی مسجدوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے، حالانکہ سب مسجدیں اللہ تعالیٰ کا گھر ہونے میں برابر ہیں، بلکہ اس حکم کے مصلحت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ لڑکی کے محلہ کی مسجد میں نکاح ہو، مگر بعض اس حکم کو دین کے بجائے فیشن کا رنگ دے رہے ہیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون یہ دوہری پالیسی اور منافقانہ چال کچھ اچھی نہیں ہے۔ بستی کی مسجد میں سادگی کے ساتھ نکاح کر لیا جائے اور بس! اسی سے صحیح معنوں میں اس تعلیم کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(بقیہ صفحہ ۲۶ سے)

یہ اہل بیت سے محبت کا تقاضا ہے؛ لیکن یہ پہلو بھی ملحوظ رہے کہ وہ سارا قافلہ راہ خدا میں شہید ہو کر خدا کی رضا پا کر جنت کے اعلی درجات پر فائز ہو چکا ہے جو کہ انسانی زندگی کا بنیادی ہدف اور مقصد تخلیق ہے، اس قابل فخر واقعہ کی وجہ سے 10 محرم الحرام جیسے عظیم و بابرکت دن کو اور اسی کے سبب پورے محرم کے مہینے کو منحوس سمجھنا ہوا پرستی اور شریعت کی صریح خلاف ورزی ہے۔

الغرض شہادت فی سبیل اللہ اسلام کی نظر میں موت نہیں بلکہ حیاتِ جاودانی کا آغاز ہے۔ یہ خسارہ نہیں بلکہ کامیابی ہے، محرومی نہیں بلکہ ابدی نعمتوں کا دروازہ ہے۔ اگرچہ شہید کی جدائی پر فطری غم محسوس کرنا جائز ہے، لیکن شہادت کو محض مصیبت، ماتم اور آہ وزاری کا عنوان بنانا قرآن وسنت کے مزاج کے خلاف ہے۔ ایک مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ شہداء کی قربانیوں پر فخر کرے، ان کے لیے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ سے خود بھی حسنِ خاتمہ اور شہادت جیسی عظیم نعمت کا سوال کرتا رہے۔

اللّٰهم ارزقنا الشهادة في سبيلك، واجعل خير أعمالنا خواتيمها، وخير أيامنا يوم نلقاك.

آمین.

گوشۂ سیرت

اُس نے سچ کہا تو تم نے مارا، جھوٹ بولا تو چھوڑ دیا

از: مرتب*

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو جنگِ بدر کے لئے اُبھارا اور اُنھیں بدر لے گئے، وہاں قریش کے قافلے موجود تھے، جس میں قبیلہ بنوحجاج کا عبد اسود بھی تھا، صحابہؓ نے اُسے پکڑ لیا اور ابوسفیان کے بارے میں تفتیش کرنے لگے، اس نے جواباً کہا: بخدا مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم، لیکن یہ قریش کا قافلہ ہے جس میں ابوجہل، ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ، امیہ بن خلف تھے، اِس بیان پر صحابہؓ نے اس کو مارا، اُس نے کہا: اچھا، اچھا میں بتاتا ہوں، مجھے چھوڑو۔ جب انہوں نے چھوڑ دیا تو کہنے لگا: بہ خدا واقعی! مجھے ابوسفیان کے بارے میں نہیں معلوم، البتہ اس قبیلہ قریش میں ابوجہل، ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ، اور امیہ بن خلف سب آئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، یہ سب باتیں سنائی دے رہی تھیں، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جب اس نے سچ کہا تو تم نے اسے مارا، اور جب اس نے تم سے جھوٹ بولا تو چھوڑ دیا، واللہ! یہ قافلہ قریش کا ہے اور ابوسفیان کی حفاظت کے لئے آیا ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سردارانِ قریش کے مقتل کی خبر دی کہ کل فلاں شخص یہاں پڑا ہوگا، فلاں شخص کا مقتل یہ ہوگا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر ہاتھ رکھ رکھ کر بتایا۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا، کوئی کافر مقتول بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک کے رکھی ہوئی جگہ سے ایک بالشت ہٹا ہوا نہ تھا، (یعنی جہاں آپ نے نشان دہی کی تھی وہیں وہ مرا ہوا پایا گیا ہے۔)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو قلیبِ بدر میں پھینک دینے کا حکم فرمایا، چناں چہ وہ پیروں سے کھینچ کر لائے گئے اور بدر کے کنویں میں اُنھیں پھینک دیا گیا۔ (دلائل النبوۃ: ۳/۴۷)

---

* استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت امِ حمید الساعدیہؓ

(زوجہ محترمہ حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ)

از: مولانا مفتی رفیع حنیف صاحب قاسمی*

نام ونسب:

یہ عظیم صحابیہ ہیں، ان کا تعلق انصار کے قبیلے خزرج سے تھا، ان کے شوہر جلیل القدر صحابی حضرت ابو حمید ساعدی انصاری ہیں، ان کے نام کے سلسلے میں اختلاف ہے، بعض نے ابو حمید ساعدی انصاری کا نام منذر بن سعد ابو المنذر لکھا، جب کہ بعض لوگ ان کا نام عبد الرحمن بن سعد بن منذر تحریر کرتے ہیں، ان سے کئی ایک روایتیں منقول ہیں، احد اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، ان کی وفات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔

قبول اسلام: یہ اپنے شوہر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

خدمت نبوی میں حاضری

حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئی، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ کے ساتھ (مسجد نبوی میں) نماز پڑھنا بہت پسند کرتی ہوں، اور میری یہ دلی خواہش ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری اتباع میں نماز پڑھنا پسند ہے، لیکن تمہارا اپنے کمرے (اندرونی کمرے) میں نماز پڑھنا تمہارے دالان (صحن کے حجرے) میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے دالان میں نماز پڑھنا تمہارے پرے گھر (احاطے) میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے گھر کے احاطہ میں نماز پڑھنا تمہاری قوم کی مسجد (محلے کی مسجد) میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہاری قوم

* استاذ فقہ وادب: ادارہ کہف الایمان ٹرسٹ، بورہ بنڈہ، حیدر آباد

کی مسجد میں پڑھنا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔راوی کہتے ہیں کہ (انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سن کر) یہ حکم دیا کہ ان کے گھر کے سب سے آخری (اندرونی) اور سب سے اندھیرے والے حصہ میں نماز پڑھنے کی ایک جگہ بنادی جائے، چنانچہ وہ وہیں نماز پڑھا کرتیں، یہاں تک وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔**فأمرت فبنى لها مسجد فى أقصى من بيتها و أظلمه، فكانت تصلى فيه حتى لقيت الله تعالى** (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ام حمید: ۸۳۸ ۳، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

حضرت ام حمیدؓ کا شوقِ عبادت:

حضرت ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مسجدِ نبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہو، لیکن شرعی احکام صرف دلی پسند پر نہیں بلکہ اللہ کی حکمتوں پر چلتے ہیں۔

عورت کی نماز کی بہترین جگہ:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرمایا کہ عورت اپنے گھر کے جتنا اندرونی اور پردے والے حصے میں نماز پڑھے گی، اس کا ثواب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔فضیلت کے درجات کی ترتیب اس طرح ہے:

۱۔سب سے افضل: گھر کا اندورنی خاص کمرہ (جہاں وہ سوتی ہے)۔

۲۔گھر کا دالان یا صحن (جہاں باقی کمروں کے دروازے کھلتے ہیں)

۳۔پورا گھریلو احاطہ (دار)۔

٤۔محلے کی قریبی مسجد۔

٥۔مسجدِ نبوی (جو ان کے گھر سے دور تھی)

حضرت ام حمید الساعدیہؓ کا عمل:

حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی روح کو فوراً سمجھ لیا؛ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے سب سے آخری اور اندھیرے والے کونے میں نماز کی جگہ بنوائی جہاں انہیں کوئی دیکھ نہ سکے، اور وفات تک وہیں نمازیں ادا کرتی رہیں۔(الدرر السنیۃ، الموسوعۃ الحدیثیۃ: dorar.net)

وفات: ان کے مزید حالات کتب سیر و تاریخ میں نہیں ملتے۔

حالیہ جنگ/ تین گزارشات

از: حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری صاحب مدظلہٗ

حالیہ ایران/ امریکا، اسرائیل جنگ، ایک ماہ سے زیادہ جاری رہ کر مذاکرات کے مرحلے میں ہے اور آگے کی صورت حال غیر معمولی طور پر ابہام کا شکار ہے، آگے کیا ہوگا کچھ کہنا مشکل ہے؛ البتہ اب تک جو کچھ ہوا اس کی روشنی میں نہایت اختصار کے ساتھ تین باتیں تین طبقات سے کہنے کو جی چاہتا ہے۔

(1) پہلی بات، ایران سے اور وہ یہ کہ اس جنگ میں چوں کہ آپ کا مقابل اسرائیل ہے اس لیے اہل سنت کے علماء وعوام نے عام طور پر کھل کر آپ کی حمایت کی ہے، آپ اس حمایت کو غنیمت جانیں اور اس کا غلط استعمال نہ کریں۔ یہ جو سادہ لوح عوام اہل سنت کے درمیان آپ کے لوگ اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے سرگرم ہوگئے ہیں اور ان کی جذباتی کیفیت کو دوسرا رخ دے رہے ہیں، اس سے باز آجائیں، یہی آپ کے اور ہم سب کے لیے خیر کی بات ہے۔

(۲) دوسری بات خلیجی ممالک کے اہل سنت حکمرانوں سے ہے کہ آپ اللہ کے واسطے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرلیں، آپ کی اب تک کی پالیسیوں نے کیا دیا ہے سوائے اس کے کہ ایران، عالم اسلام کا ہیرو بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اور آپ کی حمایت یافتہ سپر پاور آپ کو ایران کے کسی بھی خطرے یا حملے سے بچانے کی پوزیشن میں نہیں ہے یا ارادہ ہی نہیں رکھتی، مزید یہ کہ مسلمانوں کی اکثریت آپ سے دور ہورہی ہے۔

(۳) تیسری بات اپنے سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت کے تمام لوگوں سے ہے کہ ہوش کے ناخن لیں اور اپنے عقیدے کو جنگ کی بھینٹ نہ چڑھائیں، کسی بڑی طاقت سے جنگ کرنا یا اُسے چیلنج دے دینا کسی عقیدے کی صحت کی ضمانت نہیں ہے۔ اسرائیل امریکا سے ایران کی کتنی بھی سخت اور حقیقی جنگ ہوجائے شیعیت کا باطل ہونا اپنی جگہ حقیقت رہے گا۔

(ماخوذ: ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہِ اپریل ومئی ۲۰۲۶)

اصلاحی مضامین

کاش کہ ہم لوٹیں علوم نانوتوی اور گنگوہی کی طرف

از: مفتی ارشد دہلی والا

الحاد اور بدعات یہ وہ دو راستے ہیں جن سے اسلام اور اہل اسلام پر مسلسل حملے ہوتے رہے ہیں، مسلمانوں کا وہ طبقہ جو دین بیزار ہے ان کو تو الحادی شکوک وشبہات کا شکار بنایا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف جو لوگ دین دار سمجھے جاتے ہیں ان کے دین میں بدعات کی ملاوٹ کر کے ان کو خالص دین سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

روزِ اول سے علماء دیوبند کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے الحاد و بدعات دونوں ہی محاذوں پر باطل کو دھول چٹائی ہے، الحاد کی بھول بھلیاں ہو یا بدعات کی حسین وادیاں، علماء دیوبند نے مسلمانوں کو دونوں ہی سے باہر نکالنے کے لئے جہد مسلسل سے کام لیا ہے۔

ایک محاذ پر امام الاصول حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے الحاد کا قلع قمع کیا تو دوسرے محاذ پر امام الفروع مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قاطع بدعات بن کر سامنے آئے، اور ان دونوں کے علوم کے امین، جامع الاصول والفروع بنکر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے علوم نانوتوی اور علوم گنگوہی کو داستان پارینہ سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے، میرے دوستو! یقین جانو کہ ردِّ الحاد جدید کے سلسلہ میں جو خزانہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تصنیفات میں ہے، بلا مبالغہ اس کا عشر عشیر بھی کہیں اور ملنا دشوار ہے، اسی طرح ردِّ بدعات کے سلسلہ میں جو دلائل فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تحریروں میں اور ان کے امر پر لکھی گئی براہین قاطعہ میں درج ہیں وہ یقیناً بیش قیمت علمی اثاثہ ہے۔

علماء کو چاہیئے کہ علوم نانوتوی اور علوم گنگوہی کی طرف لوٹیں اور جو علوم کے دریا ان حضرات نے بہائے ہیں ان سے خود بھی سیراب ہوں اور ان کی تسہیل اور انطباق کر کے امت کو بھی اس سے نفع پہنچائیں۔

اصلاحی مضامین

کیا شہادت فی سبیل اللہ مقامِ غم ہے؟

از: مولانا مفتی محمد سلمان قاسمی*

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو آزمائش کی جگہ بنایا ہے، جہاں زندگی اور موت دونوں انسان کے لیے امتحان ہیں۔ اہلِ ایمان کے نزدیک موت اگرچہ فطری طور پر جدائی اور رنج کا سبب بنتی ہے، لیکن جب یہی موت اللہ تعالیٰ کے راستے میں، دینِ اسلام کی سربلندی اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے واقع ہوتو وہ "شہادت" کہلاتی ہے، جو اسلام میں سب سے بلند درجات میں شمار ہوتی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ اہلِ تشیع و روافض کے ساتھ مخلوط کلچر میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے معاشرے میں بعض شہادت کے واقعات بالخصوص سیدنا ومولانا حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی اس عظیم الشان شہادت کو صرف ماتم، آہ و بکا اور غم و اندوہ کے زاویے سے دیکھا جانے لگا ہے، حالانکہ قرآن وسنت کی تعلیمات بتاتی ہیں کہ شہادت درحقیقت اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام، ابدی سعادت اور جنت کی دائمی زندگی کا پروانہ ہے۔

شہادت اگرچہ ظاہراً اہلِ خانہ واہل دنیا سے جدائی کا سبب بنتی ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ غم کا نہیں بلکہ فخر، سعادت اور مبارک باد کا مقام ہے؛ یہ ایسا مبارک سودا ہے جس میں مؤمن اپنی جان اور مال پیش کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا مستحق بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والے لوگ اپنے وطن، اپنے گھر بار، اپنے اہل وعیال اور اپنی آسائشوں کو چھوڑ کر صرف اس اجر و ثواب کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

شہادت کا مقام قرآنِ کریم کی روشنی میں:

قرآن مجید نے شہداء کو مردہ قرار دینے سے منع فرمایا ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَنۡ يُقۡتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمۡوَاتٌ ۚ بَلۡ أَحۡيَاءٌ وَلٰكِنۡ لَا تَشۡعُرُونَ (البقرة:154) ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ایک اور مقام پر فرمایا: وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِینَ قُتِلُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ أَمۡوَاتًا ۚ بَلۡ أَحۡیَاءٌ عِندَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُونَ فَرِحِینَ بِمَا آتَاہُمُ اللّٰہُ مِن فَضۡلِہِ وَیَسۡتَبۡشِرُونَ بِالَّذِینَ لَمۡ یَلۡحَقُوا بِہِم مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ أَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُونَ (آل عمران) ''ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، رزق دیے جاتے ہیں، اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں عطا فرمایا ہے اس پر خوش ہیں، اور اُن کے پیچھے جو لوگ ابھی اُن کے ساتھ (شہادت میں) شامل نہیں ہوئے ان کے بارے میں اس بات پر بھی خوشی مناتے ہیں کہ (جب اُن کے پاس آ کر ملیں گے تو) نہ اُن پر ڈر ہے اور نہ ان کو غم ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات میں شہداء کرام کے درج ذیل فضائل بیان کیے گئے ہیں: ۱-ان کی ممتاز دائمی حیات ہے۔ ۲-ان کو من جانب اللہ رزق دیا جاتا ہے۔ ۳- وہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے۔ ۴- وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے، ان کے متعلق بھی ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک عمل اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آ کر یہی نعمتیں اور درجاتِ عالیہ ملیں گے۔

اور سدیؒ نے بیان فرمایا ہے: ''شہید کا جو کوئی عزیز، دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص اب تمہارے پاس آ رہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے، جیسے دنیا میں کسی دور افتادہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔'' (معارف القرآن: ج ۲، ص: ۲۳۷)

جب شہید خود خوشی اور نعمت میں ہو تو اس کی شہادت کو محض مصیبت اور غم کا عنوان بنانا قرآن کے مزاج کے خلاف ہے۔

احادیثِ نبویہ میں شہادت کی فضیلت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہید کے عظیم مقام کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کے نزدیک شہید کے لیے چھ خصوصیات ہیں: اس کے خون کی پہلی ہی بوند پر مغفرت کر دی جاتی ہے، اسے جنت میں اس کا مقام دکھا دیا جاتا ہے، عذابِ قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے، بڑی گھبراہٹ سے امن دیا جاتا ہے، عزت کا تاج پہنایا جاتا ہے اور اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔ (سنن الترمذی: 1663)

ایک اور حدیث میں فرمایا: جنت میں داخل ہونے والا کوئی شخص دنیا میں واپس آنا پسند نہیں کرے گا، سوائے شہید کے؛ وہ تمنا کرے گا کہ دنیا میں واپس جائے اور دس مرتبہ شہید کیا جائے، اس عزت وکرامت کی وجہ سے جو اس نے دیکھی۔ (صحیح البخاری: 2817، صحیح مسلم: 1877)

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ شہید اپنی شہادت پر افسوس نہیں کرتا بلکہ بار بار شہید ہونے کی آرزو کرتا ہے۔

ایک اور حدیث پر غور کریں کہ امام الانبیا سرور کائنات رسول اللہ ﷺ خود کس انداز سے شہادت فی سبیل اللہ کے مقام سے امت کو آگاہ فرمارہے ہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے:

ترجمہ: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔(صحیح البخاری:2797،صحیح مسلم:1876)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔'' پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا عمل؟ فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد۔'' پھر پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: ''حجِ مبرور۔'' (صحیح البخاری، کتاب الایمان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو اللہ کے راستے میں زخمی ہوتا ہے، اللہ کے راستے میں حقیقتاً کون زخمی ہوا ہے؟ اس کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا، وہ اپنے رب کے پاس اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے زخم سے خون جاری ہوگا، اس خون کا رنگ تو خون جیسا ہی ہوگا، لیکن اس میں خوشبو مشک کی ہوگی۔(ترمذی: ج۱ص:۲۹۵)

حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: آج رات میں نے دو آدمیوں کو خواب میں دیکھا جو مجھے لے کر درخت پر چڑھے اور مجھے ایسے محل میں داخل کیا کہ جو بہت ہی حسین تھا اور بہت ہی عمدہ تھا، اس جیسا محل میں نے کبھی نہیں دیکھا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ شہداء کرام کا محل ہے۔(بخاری: ج۱ص:۳۹۱)

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے درجے پر پہنچاتا ہے، اگرچہ وہ اپنے بستر پر مرے۔(مسلم: ج۲ص:۱۴۱)

غرض جس چیز کی خواہش خود سید الانبیاء ﷺ کریں، وہ اہلِ ایمان کے لیے باعثِ فخر ہونی چاہیے نہ کہ باعثِ حسرت، نیز حضور ﷺ کے اس ارشاد میں صاف طور پر ترغیب ہے کہ ہر مومن دل میں شہادت کی آرزو رکھے اور اس کا دل اس جذبہ سے سرشار ہو کہ جب بھی مجھے موقع ملے میں اپنی اس متاعِ زیست کو جان آفریں کے حوالے کردوں گا، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور پاک ﷺ کا عکس کامل تھے، ان حضرات کی زندگی نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے عبارت بلکہ اس کی شرح تھی، ان کے اقوال واطوار، افکار و خیالات میں تعلیمات نبویہ کے اثرات نمایاں ہوتے تھے، اسی نبوی تعلیم کا اثر ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم شہادت کے

لیے بیتاب و بے چین رہا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو دیکھیں کہ غزوۂ اُحد میں مسلمان سنگین صورتحال سے گزر رہے تھے اور ادھر حضور کی وفات کی خبر نے ان کو اور بھی زیادہ بے دم کر دیا تھا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ دشمنوں کے لشکر میں گھستے ہوئے کہتے ہیں: "إني لأجد ريح الجنة دون أحد" "میں اُحد کے اس پہاڑ کے پیچھے سے جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔" (صحیح البخاری) پھر بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے اس تاریخی واقعہ کو یاد کریں محرم 14 ھ میں جنگ قادسیہ کے خونریز معرکہ میں یہ اپنے چار جوان بیٹوں کے ساتھ تشریف لے گئیں جب میدان جنگ میں لڑائی کی صفیں لگ گئیں اور بہادروں نے ہتھیار سنبھال لیے تو انھوں نے اپنے بیٹوں کے سامنے یہ تقریر کی کہ:

میرے پیارے بیٹو! تم اپنے ملک پر دو بھر نہ تھے نہ تم پر کوئی قحط پڑا تھا باوجود اس کے تم اپنی بوڑھی ماں کو یہاں لائے اور فارس کے آگے ڈال دیا۔ خدا کی قسم! جس طرح تم ایک ماں کی اولاد ہو اسی طرح ایک باپ کی بھی ہو میں نے کبھی تمہارے باپ سے بد دیانتی نہیں کی نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا۔ لو جاؤ آخر تک لڑو۔ بیٹوں نے ماں کی تقریر سے پُر جوش ہو کر ایک ساتھ دشمنوں پر حملہ کر دیا جب نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ الٰہی عز و جل! تو میرے بچوں کا حافظ و ناصر ہے تو ان کی مدد فرما۔ چاروں بھائیوں نے انتہائی دلیری اور جانبازی کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ چاروں اس لڑائی میں شہید ہو گئے۔ تو حضرت خنساء نے فرمایا: "الحمد لله الذي شرفني بقتلهم." (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے ان کی شہادت کے ذریعے عزت بخشی۔)

یہ ایمان کی وہ کیفیت ہے جو شہادت کو سعادت سمجھتی ہے، صرف مصیبت نہیں۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا

آپ دعا کیا کرتے تھے: "اللهم ارزقني شهادة في سبيلك واجعل موتي في بلد رسولك." (صحیح البخاری) "اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت عطا فرما اور میری موت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر میں مقدر فرما۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی، اور فجر کے وقت شہر رسول میں آپ کو ایک دشمن خدا نے خنجر گھونپ دیا جس سے ان کی شہادت واقع ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت اور جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معیت کا پروانہ زبان رسالت سے حاصل ہو چکا تھا، اس کے باوجود تمنائے شہادت مقام شہادت کی اہمیت کے پیش نظر ہے۔

اقوالِ سلف:

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید سے زیادہ معزز کوئی نہیں۔"

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "شہادت اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے، اسی لیے انبیاء، صدیقین اور صالحین اس کے طالب رہے ہیں۔"

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "شہداء زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس لیے ان کی موت درحقیقت اکمل زندگی کا آغاز ہے۔"

کیا شہادت پر غم کرنا جائز ہے؟

اسلام فطری جذبات کا انکار نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر فرمایا: ''إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَإِنَّ الْقَلْبَ يَحْزَنُ'' (صحیح البخاری:1303)

" آنکھ اشکبار ہوتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے۔"

لہٰذا کسی محبوب کی جدائی پر دل کا رنجیدہ ہونا فطری امر ہے، لیکن نوحہ کرنا، سینہ کوبی کرنا، تقدیر پر اعتراض کرنا، شہادت کو محض المیہ قرار دینا یہ اللہ کے فیصلے پر ناراضی کے مترادف ہے بلکہ ایک انعام عظیم کی ناقدری جس سے بچنا بہرصورت ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ وَشَقَّ الْجُيُوبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ (صحیح البخاری:1294)

" وہ ہم میں سے نہیں جو رخسار پیٹے، گریبان چاک کرے اور جاہلیت کی پکار پکارے۔"

شہادت: غم نہیں، فخر اور مبارک باد کا مقام ہے، جب قرآن شہداء کو زندہ قرار دے، جب اللہ ان کے رزق اور فرحت کی خبر دے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود شہادت کی تمنا کریں، جب صحابۂ کرام اسے سعادت سمجھیں، اور جب شہید خود بار بار شہید ہونے کی آرزو کرے، تو پھر شہادت کو صرف غم و ماتم کا عنوان بنانا اسلامی تصورِ شہادت سے ہم آہنگ نہیں۔

ہر سال 10 محرم الحرام کو ملک بھر میں ماتم و نوحہ، جلسے جلوس، ناچ گانا اور تعزیت والم کا ماحول بن جاتا ہے اوران تمام خرافات کا محرک نواسۂ رسول جگر گوشۂ بتول حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت عظمی ہے؛ یقینا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ علیہ السلام کے اہل بیت کے ساتھ ظالموں نے جو عہد شکنی کی اور جس طرح کے مظالم ڈھائے اس کو یاد کر کے دل مغموم ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ (بقیہ صفحہ:۱۶ پر)

اصلاحی مضامین

لَو میرج اسباب ومفاسد

از: مفتی سہیل الرحمٰن قاسمی*

زندگی میں عہدِ شباب نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اسی عمر میں نوجوان زیادہ تر بنتے بھی ہیں اور بہکتے بھی ہیں، چوں کہ قویٰ مضبوط، جذبات رواں اور جوش پر ہوتے ہیں، اسی جولانی میں نوجوان لڑکے لڑکیاں ایسے فیصلے کر بیٹھتے ہیں جو اُن کی پوری زندگی کو سخت مشکلات میں ڈال دیتے ہیں، شہوانی جذبات کی تسکین انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور اس کی تکمیل کے لئے شریعت نے احسن طریق نکاح کا رکھا ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”لَمْ تَرَ لِلْمُتَحَابِّينَ مثل النِّكَاحِ“ (ابن ماجہ :3093) ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی بہترین چیز نہیں۔ یعنی جو دو لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں، ان کے لیے سب سے پاکیزہ اور درست راستہ نکاح ہی ہے۔ نکاح کرنے کے مسئلے میں عام طور پر دو طرح کی فکر کے لوگ ہیں ایک وہ جو اپنی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے والدین کی پسند کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو نالائقی سے اپنی پسند کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی پسند کو پانے کے لئے یا تو والدین کو منا لیتے ہیں یا ان سے بھاگ کر شادی رچاتے ہیں، اس عمر کے نوجوانوں کی صحیح راہنمائی کرنا بے حد ضروری ہے۔

اس سلسلے میں کالج یونیورسٹیز کے ماحول اور عصری نصاب تعلیم میں جنسیات کے مضمون نے اُنھیں آزاد بنایا ہے، پھر فلموں اور ڈراموں نے تو حیا باختگی کے سارے دروازے کھول دیے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ امت کے نوجوان بے راہ روی کا شکار ہیں، بہت سے بغیر نکاح کے ہی تعلقات قائم کر لیے ہیں، کچھ پسند کی شادی کو اپنا حق واجبی سمجھتے ہیں، راقم السطور نے نوجوانوں سے اپنی عمومی ملاقاتوں میں لو میرج اور ارینج میرج (اپنی پسند کی شادی یا والدین کے پسند کی شادی) کے تعلق سے گفتگو کی، کچھ شادی شدہ افراد سے بھی بات کی، سب کا حاصل مجھے یہ لگا کہ لو میرج کے نقصانات زیادہ ہیں بہ نسبت ایرنج میرج کے۔ سماجی ماہرین کے مطابق لو میرج 80% فیصد ناکام ہوتی ہے اور 20% فیصد لوگوں کا فیصلہ درست ہوجاتا ہے یا ان کو ان کے والدین سنبھال لیتے ہیں۔ لَو میرج کی ناکامی کے اسباب اور اس کے مضرات کے یہ چند پہلو سپردِ قلم کی جارہی ہیں۔

* انچارج شعبہ دعوت عمومی منبر ومحراب فاؤنڈیشن انڈیا

(1) لو میرج میں ایک دوسرے سے توقعات زیادہ ہوتی ہیں اور توقعات بڑھ جانے اور پورے نہ ہونے سے ہی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں جتنی زیادہ توقعات پوری نہیں ہوتی اتنے ہی زیادہ جھگڑے ہوتے ہیں۔

(2) لو میرج میں شادی سے پہلے محبت میں جوش دکھایا جاتا ہے، حسین بول اور خوب صورت خواب ایک دوسرے کو دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور شادی کے بعد جوش ٹھنڈا اور خواب غائب ہوجاتے ہیں، اور پھر نا اتفاقیاں ہوجاتی ہیں اور اپنی نادانی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

(3) لو میرج کرنے والے جوڑے ایک دوسرے کے برے ماضی سے بھی چوں کہ واقف ہوتے ہیں اور نااتفاقی کی صورت میں ایک دوسرے کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں، اور رشتہ کا تقدس ختم ہوجاتا ہے۔

(4) لو میرج کرنے والے تعلیم یافتہ یا جاب ہولڈر لڑکا لڑکی صرف ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں لیکن دونوں اپنے اپنے والدین، بہن بھائی، حقیقی رہن سہن کو نہیں جانتے ہیں، اس لئے شادی کے بعد ان سب رشتوں کو نبھانے میں ناکام ہوتے ہیں جبکہ ایرینج میرج والوں کے ذہن میں سب کو لے کر چلنے کا جذبہ اور ذمہ داری کا احساس یا ارادہ ہوتا ہے۔

(5) لو میرج کرنے والوں میں کچھ ایسے اسیرِ محبت بھی ہوتے ہیں جو بے کار اور بے روزگار رہتے ہیں یا عشقیہ مزاج رکھتے ہیں کبھی کبھی تو فیس بک اور انسٹا گرام پر محبت کا تعلق قائم کر لیتے ہیں اور شادی کر کے خود کوئی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔ نتیجۃً شادی کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، ایسے جذباتی بے روزگار عام طور پر شرابی یا جرائم کے عادی بن جاتے ہیں، اور چار دن میں اچھے خاصے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔

حسن صورت چند روزہ حسن سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں اس سے خوش ہوتا ہے دل

اس کے بالمقابل سچے دل اور اچھی عقل وسیرت والے لڑکا اور لڑکی والدین سے بات کر کے اپنا رشتہ طئے کراتے ہیں ویسٹرن کلچر کے طرز پر پہلے سے تعلقات قائم نہیں کر لیتے۔

اسلام مودۃ اور رحمت کو رشتوں کی بنیاد کہتا ہے، مودت ایک ایسی محبت ہے جس میں ذمہ داری کو بھی تقسیم کیا گیا ہو اور ارینج میرج میں ذمہ داری کا احساس پہلے اور محبت کے جذبات بعد میں ہوتے ہیں اور لَو میرج میں محبت کے جذبات پہلے ہوتے ہیں، اور ذمہ داری نایاب یا کم یاب ہوتی ہے جو کہ نزاعات کا سبب ہے۔

(6) لو میرج کی ایک وجہ وقت پر شادی نہ کرنا ہے جبکہ شریعت نکاح میں جلدی کرنے کی ترغیب دیتی ہے، لڑکی کی تعلیم کا بہانہ بنا کر نکاح نہ کرنا یہ لڑکی کی فطری محبت کے جذبے کی ناقدری ہے، نکاح کرنے میں تعلیم

رکاوٹ نہ بنے اور باپردہ ماحول میں تعلیم کے حصول میں نکاح رکاوٹ نہ ہواوراسی طرح چھوٹی بہن کی شادی کے بہانے بڑے لڑکے کے نکاح میں تاخیر معاشرے کی وہ سنگین غلطی ہے جولومیرج کی راہ نکالتی ہے۔

(7) لومیرج کی ایک وجہ مخلوط نظام تعلیم ہے، جہاں نوجوان لڑکےلڑکیاں کلاس میٹ بن کرایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اورفارغ اوقات میں ساری اخلاقی حدوں کو پار کرتے ہیں، بل کہ آج کل ایمان سے بھی ہاتھ دھورہے ہیں، اللہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔اس لئے اپنے بچوں کی بہتر تعلیم کا بندوست ایسے کالجز اور اداروں میں کریں جہاں دونوں صنفوں کی تعلیم کا نظام علاحدہ علاحدہ ہو۔

(8) لومیرج کی ایک اور وجہ والدین کا اولاد کوفون اور انٹرنیٹ کا آزادنہ اورتنہائی میں استعمال کی اجازت دینا اوراس کو بچوں کے ساتھ محبت وخیرخواہی اور زمانہ سے ہم آہنگی سمجھنا ہے جبکہ آج کے سنگین ماحول میں اس طرح کی کھلی چھوٹ اولاد کے ساتھ بدخواہی ہے۔

(9) لومیرج کی ایک وجہ نوجوانوں کا بالخصوص لڑکیوں کا فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر رئیل لائف اور ریل لائف میں فرق نہ کرنا بھی ہے، بہت سی لڑکیاں اس دھوکے اور فریب میں اپنی زندگیوں کوتباہ کررہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ ارینج میرج ناکام ہوتی ہے۔

(10) لومیرج کا ایک سبب اولاد کا اپنے بڑوں پر سے اعتماد ختم ہوجانا ہے، اس کی تین وجوہات ہیں: ۱؎ بڑوں کا درست راہنمائی اورصحیح تربیت نہ کرنا۔ ۲؎ والدین کا اولاد پر بے جاسختی کرنا۔ ۳؎ مکمل آزادی دینا۔ جب کہ والدین اوراولاد کے تعلقات دوستانہ ہونا چاہیئے اور بچپن ہی سے اُنھیں ذہن نشین کرایا جائے کہ والدین اُن کے خیرخواہ ہیں۔ بچوں کی جائزخواہش پوری کریں، ناجائزخواہش پرسمجھائیں ذہن سازی کرکے روکیں۔

(11) لومیرج میں ظاہری حسن پرفریفتگی غالب سبب ہوتا ہے، لڑکالڑکی رشتۂ ازدواج کے تقاضوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں، جب کہ اسلام نے نکاح میں کفاءت کا نظام بھی رکھا ہے، حسب نسب میں دینی شرافت، خاندان کا بیک گراؤنڈ، تعلیم وصنعت اورتجارت وغیرہ کی برابری ملحوظ ہوتی ہے۔

(12) لومیرج کا ایک سبب احساس کمتری ہے۔ والدین بچیوں میں خوداعتمادی اوراپنی عزت کی اہمیت پیدا کریں، ورنہ غیرمحرم کے ایک دوتعریفی جملے بچیوں کومتاثر کردیتے ہیں پھران کی عزتیں اُتر جاتی ہیں خوداعتماد لڑکی کسی کی تعریفوں کے جھانسے میں نہیں آتی وہ جانتی ہے کہ میری تعریف سے اسکا کیا مقصد ہے؟

بہرحال! یہ چند اسباب ووجوہات ہیں جن سے لومیرج کو ماہرین بل کہ سماج کی نظر میں بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، نوجوان لڑکیوں اورلڑکوں کوسمجھنا چاہیئے کہ

● چھپ چھپ کر بات کرنے والوں اور ناجائز رشتے بنانے والوں، اللہ سے نہ ڈرنے والوں، والدین وخاندان کی عزت کا خیال نہ رکھنے والوں کا کیا بھروسہ کہ وہ شادی کے بعد کسی اور سے رابطہ نہیں کریں گے؟ اور ایک دوسرے کے لئے اچھے شریکِ حیات ثابت ہوں گے، اور ایک خوش گوار زندگی بسر کر پائیں گے؟ ،جبکہ نکاح کے بعد اس رشتہ کو سنبھالنے کے لئے ایک دوسرے پر بھروسہ، عفت و پاک دامنی، اور خوف خدا کا ہونا ضروری ہے ورنہ سب من مانی کر کے اس مقدس رشتے کو خراب کر دیتے ہیں۔

یاد رکھیں! رشتوں میں جب تک احترام نہ ہو اس وقت تک رشتے دیر پا نہیں رہتے، محبت کے ساتھ عزت واحترام ایک دوسرے کے جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت، بڑوں کا پاس ولحاظ یہ سب رشتوں کے لازمی عناصر ہیں۔ نری محبت رشتوں کے استحکام کا سبب نہیں ہوتی۔

● رشتۂ نکاح کے لئے چند صفات میں مرد عورت سے فائق ہونا یا برابر ہونا بہتر ہوتا ہے:

1۔ علم، 2۔ عزت، 3۔ شہرت، 4۔ مال، 5۔ محنت، 6 ۔صبر وحلم، 7۔ خودداری وقار وتمکنت میں بڑا ہو۔ لڑکا اور لڑکی دونوں ان صفات کو اپنے اندر تلاش کریں۔ ورنہ اچھی خاصی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

● والدین کو چاہیئے کہ اپنی اولاد کی تربیت کا دھیان رکھتے ہوئے اُن میں اللہ کی سچی محبت، کتاب اللہ کی عظمت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام، دین ومذہب کی وقعت، خاندانی ونسبی شرافت کی اہمیت، بڑوں کی توقیر وعزت اور خوفِ خدا جیسی صفات پیدا کرنے کی کوشش کریں، تاکہ احساسِ زندہ اور جینے کا سلیقہ معلوم ہو۔

● سرپرستوں کو سوچنا چاہیئے کہ لڑکوں کو دسویں کے بعد کام پر لگا دینے کے بہ جائے اس کی فطری صلاحیتوں کو اُبھارا جائے اور سماج کا ایک ذمہ دار فرد بنایا جائے، اور لڑکیوں کو دسویں کے بعد کو ایجوکیشن سے محفوظ اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں تو اچھا ہے ورنہ اُن کی فطری صفات اور زندگی کی ضروری صلاحیتیں بنانا نہایت ضروری ہے، نکاح سے پہلے گھر گرہستی، سیون پروَن، کیچن کا حسنِ انتظام، عفت و پاک دامنی کا احساس، خیالات کی طہارت، ماتحتوں کی دیکھ بھال کا سلیقہ، اور بہترین تربیت کے گُر سکھانا اُن کی خوش گوار زندگی کا ضامن ہوگا۔

● اگر ہم مذہب لڑکا لڑکی کو محبت ہو جائے تو والدین اپنی مرضی مسلط کرنے کے بہ جائے سنجیدگی سے ان کی پسند کا جائزہ لیں کہ اُن کا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا مناسب ہے یا نہیں؟ خاندان کے سمجھ دار بڑوں بزرگوں یا علمائے امت اور اہل اللہ سے مشاورت کے بعد خوش اسلوبی اور باہمی ہم آہنگی سے اس مسئلے کا حل نکالیں۔ نوجوان بچوں کے غلط فیصلہ کرنے کے بعد سمجھانے سے بہتر ہے پہلے ہی سے صحیح تربیت کا اہتمام کرلیں۔

وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضی

تذکرۂ اسلاف

محدثِ کبیر حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوریؒ

کی خانگی زندگی کے چند پہلو

از قلم: مولانا محمد سعید پالن پوری*

والد محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی وفات کے بعد سے مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہے، ارباب قلم والد محترمؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال رہے ہیں، ان میں ایک گوشہ والد محترمؒ کی خانگی اور گھریلو زندگی کا بھی تھا، خانگی زندگی کے احوال پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم بھائیوں کو حکم ہوا، اس لیے کہ عربی مقولہ ہے: ''صاحِبُ البیتِ أدرَیٰ بما فیه'' (گھر کے لوگ ہی گھر کے احوال اچھی طرح جانتے ہیں) اسی حکم کی تعمیل میں یہ چند اوراق لکھے جا رہے ہیں۔

مساوات و برابری

حضرت والد صاحبؒ کا خانوادہ کافی بڑا ہے، خود ہم بھائی بہن درجن سے زائد تھے، پھر ہماری اولاد سب مل کر چار درجن کے قریب ہیں، اتنا بڑا گھرانہ ہونے کے باوجود والد صاحب سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، سب کے ساتھ برابری اور مساوات کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، پوتوں پوتیوں میں جب کھانے کی کوئی چیز تقسیم کرنی ہوتی تو کسی ایک بچے کو بھیج کر پہلے سب کو اپنے کمرے میں بلا لیتے، پھر ان سب میں چیز کو برابر سرابر تقسیم فرماتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ جن بچوں کی طرف طبعی میلان زیادہ تھا ان کو زیادہ دیتے ہوں یا الگ سے بلا کر صرف انھیں کو دیتے ہوں، نہیں! یہ آپ کے مزاج کے خلاف تھا۔ مساوات کا یہ عمل دیگر موقعوں پر بھی دیکھنے کو ملتا تھا، گھر کے اضافی خرچوں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایک معتد بہ رقم ہر سال والد صاحبؒ جب کتب خانہ کا حساب کرتے تھے اپنی اولاد کو عنایت فرماتے تھے، یہاں بھی عنایت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ صرف دیوبند میں مقیم وفروکش بچوں کو یہ رقم ملتی ہو، یا صرف نرینہ اولاد کو ملتی ہو، نہیں! سب بھائی بہنوں کو ملتی تھی، بہنوں کے باب میں یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ ان کو صرف میراث میں بھائیوں سے آدھا حصہ؛ ان کے حصہ شرعی کے مطابق ملا، باقی دیگر تمام جگہوں پر والد صاحبؒ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکی کے حصوں میں فرق نہیں کیا،

* استاذ جامعۃ الامام محمد انور شاہ کشمیری دیوبند

سب کو برابر عنایت فرماتے تھے۔

مساوات ہی نہیں عدل بھی

یہ جو مساوات و برابری والا عمل تھا اس پر والد صاحبؒ آنکھ بند کر کے عمل پیرا نہیں ہوتے تھے کہ ہر جگہ مساوات ہی فرماتے ہوں، بعض مواقع ایسے بھی تھے جہاں وہ مساوات کو چھوڑ دیا کرتے تھے، اور مساوات کا یہ چھوڑنا کسی بچے پر ظلم کے لیے نہیں؛ بلکہ عدل وانصاف کے حصول کے لیے ہوتا تھا، ان مواقع میں سے ایک موقع یہ تھا کہ سالانہ عنایتوں پر ملنے والی مذکورہ بالا رقم والد صاحبؒ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں برابر تقسیم نہیں فرماتے تھے، ظاہر ہے کہ متاہلانہ زندگی گزارنے والوں کے اخراجات کنواروں اور نا کتخداؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ اس فرق کو ملحوظ رکھا کرتے تھے، اسی وجہ سے متاہل کے مقابلے میں غیر متاہل کو ملنے والی یہ رقم کچھ کم ہوتی تھی۔

مشترکہ خاندان یا علاحدہ

یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان موضوع بحث رہتا ہے کہ شادی کے بعد والدین کا اپنی اولاد کو اپنے ساتھ رکھنے والا نظام زیادہ مفید ہے یا بچوں کو الگ کر دینے والا نظام، بالفاظ دیگر مشترکہ گھر کا نظام زیادہ مفید وکارآمد ہے یا الگ الگ گھر کا نظام، دونوں نظاموں کے فوائد بیان کرنے والے مل جاتے اور دونوں اپنے اپنے حق میں غور وفکر کو دعوت دیتے؛ دلائل وبراہین اور شواہد ونظائر بھی رکھتے ہیں، والد صاحبؒ نے ہم درجن بھر بھائیوں کے لیے ایک بیچ کی راہ نکالی جس کے دینی ودنیوی فوائد ہم سبھی نے محسوس کیے، وہ یہ کہ الگ بھی کر دیا اور الگ نہیں بھی کیا۔ عموم خصوص من وجہٍ کی نسبت ہوگئی، الگ کر دیا اس معنیٰ میں کہ والد صاحبؒ نے شادی کے بعد سب بچوں کو اپنے پلو سے باندھے نہیں رکھا، ہوتا یہ تھا کہ جب چھوٹے بھائی کی شادی کی تاریخ متعین ہوتی تو تاریخ کا یہ متعین ہونا بڑے بھائی کے الگ کیے جانے کا الارم ہوتا، والدین اپنے ساتھ صرف چھوٹی بہو کو رکھتے تھے، اور جب تک اگلے لڑکے کی شادی نہ ہوا ُس بہو کی تربیت فرماتے تھے، ڈیڑھ دو سال کے بعد جب اگلے لڑکے کی شادی ہوتی تو بڑے بھائی کو الگ بلا کر گفتگو کرتے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین فرماتے، کچھ مہینے کے راشن کے پیسے دیتے، چولہا، ضروری برتن، کپڑوں بستروں کے لیے الماری اور ایک فِرِج بھی دیتے، اور سب سے بڑھ کر حوصلہ دیتے کہ دیکھو ہم تمہیں صرف الگ کر رہے ہیں، ہم مر نہیں رہے ہیں، الگ اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکو، آج نہیں تو کل ہمارے مرنے کے بعد تمہیں الگ ہونا ہی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اپنا گھر

چلایا کیسے جاتا ہے؟ اسے تم ہماری حیات ہی میں سیکھ لو، گھر کے چلنے میں کوئی مسئلہ یا پریشانی پیش آئے تو تم ہمارے پاس کبھی بھی آسکتے ہو۔ ان کے اس حوصلہ دینے اور آگے کے گھریلو امور میں مسلسل نگرانی فرماتے رہنے کے باعث ہم سبھی بھائی بحمد اللہ والد صاحبؒ کی حیات ہی میں برسر روزگار ہوکر اپنا اپنا گھر چلا رہے تھے، سب بھائیوں کی شادی ہوجانے کے بعد والد صاحب کے حکم وخواہش کے بموجب رسمی طور سے ان کے کھانے پینے کے جملہ امور برادرم احمد سعید سلّمہ کے گھر سے انجام دیے جاتے تھے اور غیر رسمی طور سے سبھی گھروں سے۔ یہ تو ہوا الگ الگ کرنا، اور الگ الگ نہ کرنا بایں معنی کہ والد صاحبؒ نے ہم بھائیوں کو جو الگ الگ مکان دیے، وہ الگ الگ محلوں یا پلاٹوں میں نہیں تھے؛ بلکہ ایک بڑے پلاٹ میں انگلش حرف تہجی یو(U) کی شکل میں بھائیوں کی تعداد کے بقدر درجن بھر درمیانے انداز کے (نہ بہت بڑے نہ بالکل چھوٹے) مکانات بنوائے جن کی ہر چیز بشمول بجلی کا میٹر اور پانی کی پائپ لائن الگ الگ تھی، والد صاحبؒ نے اپنی رہائش بھی انھیں مکانوں میں سے ایک مکان میں رکھ لی۔ یوں ہم سب بھائی داخلی طور سے الگ الگ اور خارجی طور سے والد صاحبؒ کے ساتھ تھے، والد صاحبؒ کو بھائیوں میں سے اگر کسی کو بلانا ہوتا تو وہ کسی بھی بچے کو بھیج کر جب چاہتے بلا لیتے، ان کی طبیعت کبھی ہلکی سی بھی خراب ہوتی تو آن کے آن میں سارے بھائی ان کے کمرے میں جمع ہوجاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ برتن جب دو ہوتے ہیں تو وہ بجتے ہیں؛ جب کہ یہاں درجنوں کی تعداد میں برتن تھے؛ مگر والد صاحبؒ اپنے اس انوکھے نظام کے ذریعہ برتنوں کے بجنے کے اس احتمال کو زمین سے لگاگئے، دست بدعا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کو زمین سے لگائے رکھیں، اللّٰہم لا تفتنا بعدہ و لا تحرمنا اجرہ۔

الگ الگ کرنے کا دینی فائدہ

بھائیوں کو الگ الگ گھر دینے کے دینی اور دنیوی ہر دو فوائد ہم سبھی نے محسوس کیے، دنیوی فوائد تو طوالت کے پیش نظر قلم زد کیے جاتے ہیں؛ البتہ دینی فائدوں میں سے ایک بڑے فائدہ کا تذکرہ فائدے سے خالی نہیں، وہ یہ کہ بھابھیوں کو جو حفظ کی سعادت حاصل ہوئی اس سعادت کے حصول میں اس الگ الگ گھر کے نظام کا بھی بڑا کردار رہا، آج بحمد اللہ وہ خود حافظہ بن کر نہ صرف اپنی اولاد کو حافظ بنا چکی اور بنا رہی ہیں بلکہ محلہ کے بچوں اور بچیوں کو بھی صحیح ادائیگی کے ساتھ ناظرہ خواں اور حافظ بنا کر والدین کے نامۂ عمل میں نیکیوں کے اضافہ کا موجب بن رہی ہیں، اس خامہ پرداز کی اہلیہ کو بھی شادی اور بچہ ہوجانے کے بعد اسی نظام کی برکت سے حفظ قرآن کریم کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد راقم کو پتہ بھی نہ چلا اور فقیر زادی کو بھی انھوں نے ازخود حافظہ بنا دیا، جب راقم کی اہلیہ کا حفظ مکمل ہوا تو اس خوشی وسعادت کا اطلاعی مراسلہ خاص دوستوں کے ایک گروپ میں ارسال

کیا تھا، دوستوں نے جہاں مبارک بادی اور دعاؤں سے نوازا، وہیں یہ سوال بھی کیا کہ آخر شادی اور بچے ہوجانے کے بعد خاتونِ خانہ کے لیے حفظ کر لینا کیسے ممکن ہوتا ہے؟ اس پر روشنی ڈالی جائے، جواب میں جو پوسٹ لکھ کر گروپ میں ارسال کی گئی تھی اسے افادۂ عام کے لیے یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ والد صاحبؒ کے جاری کردہ اس نظام کے دینی فائدے، کوئی سمیٹنا چاہے تو وہ سمیٹ سکے، بالخصوص مدارس اسلامیہ کے وہ اساتذہ جو مدرسہ کی جانب سے فراہم کردہ فیملی کواٹرز میں رہتے ہیں، ان کے لیے یہ نظام بالخصوص مفید و کارآمد ہوسکتا ہے کہ ان فیملی کواٹرز اور ہم بھائیوں کے مکانات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں ”سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ بندے کا اپنا چولہا ہو، گھر والوں سے ایک دم الگ۔ اپنا چولہا اپنی جلن۔ اپنا حقہ اپنی گڑ گڑ۔ دوسرے نمبر پر ضروری ہے: صحیح ٹائمنگ، اور اس باب میں مدرسے کی ٹائمنگ سے بڑھ کر کوئی ٹائمنگ نہیں، بڑی بابرکت ٹائمنگ ہے یہ، پرکھا تو جائے؛ چنانچہ ہم دارالعلوم کے گھنٹوں کو فولو کرتے ہیں، پہلے گھنٹے کی آواز آتے ہی پڑھائی شروع۔ آخری گھنٹہ لگتے ہی چھٹی۔ آیئے پڑھائی شروع کرتے ہیں۔ کہاں سے شروع کی جائے؟۔۔۔۔ چلئے مغرب سے شروع کرتے ہیں۔ مغرب بعد نیا سبق یاد کیا جاتا ہے عشا تک، اذان پر چھٹی، عشا کی اذان پر صرف پڑھائی سے چھٹی ہوتی ہے، امور خانہ سے نہیں۔ اذان کے بعد رات کے کھانے کی تیاری کرنی ہے، رات میں سالن نیا نہیں بنے گا، روٹی بھی ابھی نہیں بنے گی، وہ تو عصر میں بن جانی ہے، ہاں عشاء کی اذان کے بعد سادہ سفید چاول ضرور بنائے جاسکتے ہیں جن کو بھیگنے کے لیے پہلے ہی رکھ دیا جاتا ہے، اذان کے آدھے گھنٹے بعد نماز ہونی ہے، نماز کے بعد کھانا کھایا جائے گا۔ واضح رہے اگر آپ کا معمول مغرب بعد کھانا کھانے کا ہے تو اسے ضرور بالضرور تبدیل کرنا ہوگا۔ مغرب بعد کا وقت بڑا برکتی اور قیمتی ہے، اسے کھانے کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد پندرہ بیس منٹ ادھر ادھر گھوم کر کھانا ہضم کر لیں۔ اس کے بعد جلدی سو جانا ہے؛ تاکہ فجر میں اٹھنا آسان رہے، فجر میں اٹھ کر سبق تازہ کریں۔ بعد نماز فجر سبق سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد ناشتہ کی تیاری میں لگنا ہے، واضح رہے کہ ناشتہ کے لیے روٹیاں تازہ نہیں بنیں گی، باسی ہوں گی رات والی؛ بلکہ عصر والی، ناشتہ اسی باسی روٹی سے ہوگا، ہاں اگر سبق سنانے کے بعد آپ کو کافی وقت مل رہا ہو تو ضرور تازہ روٹیاں بنائی جاسکتی ہیں، ناشتہ سے فارغ ہوکر اگر بچے ہوں تو ان کو اسکول اور مدرسے کے لیے تیار کیا جائے گا۔ بچوں کو بھیج کر خود پڑھنے میں لگا جائے گا۔ پہلے گھنٹے سے چوتھے گھنٹے تک آموختہ یاد کیجیے۔ صبح میں آموختہ ہو کہ صبح میں وقت زیادہ ملتا ہے، شام میں سبقاً پارہ۔ جب آموختہ یاد ہوجائے یا یاد سا ہوجائے تو اس کو دہراتے وقت دوپہر کے سالن کے لیے پیاز لہسن سبزی وغیرہ ساتھ ساتھ کاٹ لیجیے۔ کپڑے بھی واشنگ مشین

میں گھمائے جاسکتے ہیں۔ چوتھے گھنٹے کے آس پاس آموختہ سنایا جائے گا۔ سنانے کے بعد کھانے کی تیاری۔ واضح رہے دوپہر میں سالن اتنا بنانا ہے کہ وہ رات کو بھی چلے؛ بلکہ تھوڑا سا صبح ناشتے میں بھی، بارہ بجے تک ہر حال میں کھانا کھالینا ہے۔ پھر قیلولہ نمازِ ظہر تک، نمازِ ظہر کے پندرہ منٹ بعد دارالعلوم کا گھنٹہ لگتا ہے، گھنٹہ لگتے ہی پڑھائی شروع، پارہ سبق یاد کیجیے؛ چونکہ پارہ سبق ہے؛ اس لیے نسبتاً جلدی یاد ہوگا، ایسے میں بچوں کے "ہوم ورک" میں تعاون بھی کرسکتے ہیں۔ عصر کی اذان کے آس پاس پارہ سبق سنایا جائے گا، عصر کی نماز کے بعد رات کے کھانے کی روٹیاں بنانی ہیں، اور اتنی مقدار میں بنانی ہیں کہ وہ ناشتے میں بھی چلیں، روٹیوں کا بوجھ اگر زیادہ ہو رہا ہو تو سادہ چاول بھی روٹیوں کے ساتھ لگالیں، کبھی طبیعت اگر ناساز ہو یا مہمانوں کے ساتھ گفتگو میں عصر بعد کا وقت چلا گیا ہو یا روٹیاں بنانے کا دل نہ کررہا ہو تو روٹیاں اب بازار سے آئیں گی، اسی طرح مشکل سبق والے دن بھی روٹیاں یا پورا کھانا بازار سے آسکتا ہے، عصر کے بعد مغرب آگئی، مغرب ہی سے ہم نے آغاز کیا تھا، دن مکمل، معمول اور روٹین سے ہٹ کر جو کام ہیں جیسے سینا پرونا، گھر دھونا، کہیں آنا جانا، کسی کی دعوت کرنا، اس طرح کے امور یا تو عصر کے بعد انجام دیے جائیں گے، یا پھر جمعرات کے دن ظہر بعد سے جمعہ تک میں، یا پھر عورتوں کے اپنے مخصوص دنوں میں انجام دیے جائیں گے۔

تقسیم میراث

والد محترم اپنے مزاج کے مطابق اپنی زندگی ہی میں بچوں کو خود کفیل بنا کر اپنی ذمہ داریوں کو کم کرتے چلے جارہے تھے، اسی تناظر میں انھوں نے اپنی میراث اپنی حیات ہی میں تقسیم فرمادی، راقم سطور کی نظر میں تقسیم میراث کا یہ عمل بھی اسی درجہ اہم ہے جیسا اپنی اولاد کو الگ الگ گھر بنا کر دینا۔ رشتہ داروں کی وفات پر والد صاحبؒ کا معمول ہم نے یہ دیکھا کہ وفات کے تین چار دن بعد وہ مرحوم کی میراث تقسیم فرما دیتے تھے، تازہ ترین میراث انھوں نے تین چار مہینے پہلے ہی ہمارے مرحوم بھائی: حافظ سعید احمد رحمہ اللہ کی تقسیم فرمائی تھی، قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ گھر کے بڑے کے گزر جانے کے بعد **اللّٰھم لا تفتنا بعدہ** پڑھ پڑھ کر جس فتنہ سے بچنے کی اور پس ماندگان کے درمیان اتحاد، یگانت اور بھائی چارگی کی دعا مانگی جاتی ہے، تقسیم میراث کا یہ عمل؛ اگر اس میں ذرا سی بھی اونچ نیچ رہ جائے تو اس اتحاد و یگانگت کو سبوتاژ کرنے کے لیے اکیلا ہی کافی ہوتا ہے، میراث میں مال و منال ہی نہیں؛ بعض دفعہ دل بھی تقسیم ہوجاتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ والد صاحب کے درجات بلند فرمائیں کہ وہ دلوں کو تقسیم کرنے والے اس مشکل مرحلہ کو اپنی حیات ہی میں بحسن وخوبی

انجام دے گئے۔ اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال پہلے اپنے سارے بچوں کو عید الاضحیٰ کی تعطیلات میں دیو بند بلایا، پھر ایک رات سب کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور ذاتی خرچہ کی تکمیل کے مد میں کچھ مال روک کر باقی کل اثاثہ بچوں اور بچیوں کے درمیان ان کے شرعی حصے کے مطابق تقسیم فرما دیا، جہاں تقسیم سیدھے سیدھے ہو سکتی تھی وہاں تقسیم سیدھے سیدھے کی، جہاں وجہ ترجیح نہ تھی وہاں حصے قرعہ اندازی کی وساطت سے تقسیم فرمائے، یوں یہ مشکل مرحلہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام پا گیا اور اس تقسیم پر کسی طرف سے آواز نہیں اٹھی۔ یہ اسی پیشگی تقسیم میراث کی برکت تھی کہ اپنی وفات سے پہلے کے آخری ہفتے میں والد صاحب نے دیو بند میں رہ جانے والے بچوں، گھر اور کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، ان کو آخری ہفتے میں صرف دو باتوں کی فکر تھی، ایک گٹھامن مدرسہ کا نیا مہتمم اور تعلیمی ذمہ دار کون ہو، اسی مرض الوفات میں انھوں نے رات ڈھائی بجے مدرسہ کے ایک قدیم استاذ وصدر مدرس مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کو فون کر کے نئے مہتمم کی تعیین فرمائی اور آئندہ کا لائحہ عمل دیا۔ دوسری چیز تھی نماز، انتہائی نگہداشت کی یونٹ میں ہونے کی وجہ سے آخری ہفتہ میں ان کی چند نمازیں قضا ہوئیں، جب بھی وہ بات کرنے کی حالت میں ہوتے تو نہ صرف تیمارداروں سے قضا شدہ نمازوں کی تعداد کے بارے میں استفسار فرماتے؛ بلکہ نہلانے اور ہسپتال کے ڈریس کے بجائے اپنے معمولی کپڑے پہنانے پر اصرار بھی کرتے تاکہ جو نمازیں قضا ہوئی ہیں ان کو ادا کر سکیں۔ دیو بند میں پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں اگر انھوں نے کوئی پیغام بھجوایا تو وہ صرف یہ تھا کہ بھائی (عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب دامت برکاتہم) کو سلام کہنا!

تعلیم و تربیت

حضرت والد صاحبؒ کثیر العیال تھے، دار العلوم دیو بند میں ترمذی، بخاری اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی اہم اور وقیع کتابوں کی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے کاموں کی بے پناہ مصروفیت کے باوصف آپ نے سب بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ذاتی دلچسپیوں کی بنیاد پر انجام دی، تعلیم و تربیت کی یہ ذمہ داری آپ نے جو اپنی عملی زندگی کے آغاز سے انجام دینی شروع کی تو اسے تا حین حیات تیسری نسل تک انجام دیتے رہے، عملی زندگی کے آغاز میں ہمارے چچاؤں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا، اس تعلق سے تفصیل کی ضرورت نہیں کہ عم مکرم حضرت مولانا مفتی محمد امین پالن پوری صاحب دامت برکاتہم مرتب فتاوی و استاذ حدیث دار العلوم دیو بند تفصیل سے اس پر روشنی ڈال چکے، چچاؤں کے بعد اولاد کا نمبر شروع ہوا تو ہمارے سب سے بڑے بھائی مفتی

رشید احمد پالن پوری رحمہ اللہ کو حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ ہماری والدہ ماجدہ رحمہا اللہ کو بھی حفظ کرادیا، والدہ محترمہؒ کو حفظ کرانا آپ کا ایک نہایت مفید و مستحسن فیصلہ رہا، والدہ محترمہؒ کی شکل میں ایسا معاون ملا کہ باقی دیگر اولاد کو حفظ کرانے میں والد صاحبؒ کی ریاضت کم ہوگئی، اس کے بعد والد صاحبؒ بچے کو بسم اللہ کراتے، باقی کا کام والدہ ماجدہؒ کا ہوتا جب ناظرہ قرآنِ پاک ختم ہوجاتا تو حفظ شروع کراتے، فجر کی نماز کے بعد ہی والد صاحب سبق سنتے پھر آموختہ اور سبق کے پارے والدہ صاحبہ یاد کراتیں اور سنتیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ درجن بھر اولاد دماغی قوی کے تناظر میں برابر ہو، کمی بیشی ہونا فطری تھا اور وہ ہوا بھی، ہم میں سے بعض ایسے تھے کہ اپنے مخصوص دماغی قوی کے ساتھ والد صاحبؒ کے پاس حفظ نہ کر پاتے، حفظ کے باب میں جس صبر و تحمل اور ضبط و برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صبر و برداشت عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت زیادہ ودیعت کی گئی ہے، پھر وہ عورت اگر ان بچوں کی ماں بھی ہو تو اس کے ضبط و برداشت کا مستوی اور بڑھ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قوائے دماغی میں فرق ہونے کے باوصف والدہ ماجدہؒ سب کو حفظ کرالے گئیں، جب ہمارا قرآن بالکل تیار ہوجاتا تو دور کے لیے والد صاحبؒ کے پاس بھیجا جاتا، والد صاحبؒ بڑی توجہ سے دور سنتے، اگر بچہ ان کے طے کردہ معیار کے مطابق دور سنا دیتا تو اب وہ اس کو اردو پھر فارسی پڑھانا شروع کرتے، تختی پر لکھنا سکھاتے، یہاں سے والد صاحبؒ کا کام شروع ہوجاتا، اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں نصاب کے مطابق وہ بذات خود پڑھاتے، اگر کوئی آسان کتاب ان کے معیار پر نہ اترتیں تو کتاب تصنیف فرماتے، آسان صرف، آسان نحو اور آسان فارسی قواعد اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں، ذاتی تدریس کے پہلو بہ پہلو معاونین کا تعاون بھی لیتے، حضرت الاستاذ مولانا مفتی خورشید انور گیاوی صاحب دامت برکاتہم ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاری شفیق الرحمن صاحب دامت برکاتہم استاذ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند مدظلہ تعاون و معاونت کی اسی سلسلۃ الذہب کی آب دار و بارونق کڑیاں ہیں، درجہ دوم عربی یا کبھی درجہ سوم عربی تک تعلیم دی جاتی، اس کے بعد دارالعلوم کے داخلہ امتحان میں شرکت کرائی جاتی، داخلہ ہوجانے کے بعد بچہ کے تعلیمی امور کی نگرانی فرماتے رہتے، درس گاہ کی حاضری اور ششماہی و سالانہ امتحانوں میں ملنے والے نمبر و فیصد پر نظر رکھتے، مدارس میں رائج نصاب کے دوش بدوش ہندی، انگلش اور حساب کے ضروری مضامین اور بنیادی کتب بھی پڑھاتے، پھر فارغ ہونے کے بعد بچہ کو برسر روزگار بھی خود فرماتے، جو مدرسے کی لائن کے ہوتے ان کو مدرسے میں لگاتے، جب کہ دیگر کو کاروبار اور تجارت میں جماتے؛ چونکہ والد صاحبؒ مدرس بھی تھے اور تاجر بھی، دونوں میدانوں کے وہ گرم و

سرد چشیدہ تھے؛ اس لیے اپنے بچوں میں ہر دو طبقہ کو ہر دو اعتبار سے ان کی عملی زندگی کے لائحہ عمل اور طریقِ کار بتاتے اور اپنی زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کی روشنی میں افادہ وفیض رسانی فرماتے رہتے تھے۔

عظمت وعبقریت

آج جب کہ ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے ہیں، اور دو دو چار چار بچوں کی تعلیمی ذمہ داریاں سر پر آن پڑی ہیں تو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم وتربیت کے باب میں ان کی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جد وجہد کا اندازہ ہوتا ہے، کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، درجن بھر اولاد کی صرف تعلیم وتربیت کا فریضہ خوش گوار طور پر انجام دے اور ان کو برسرروزگار کر کے اس حد تک خود کفیل بنا جائے کہ والد ومربی کے گزر جانے کے بعد وہ اولاد کسی کی دست نگر ومحتاج نہ رہے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے کمال وامتیاز کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے، صرف تدریس کی وادی کا طویل، پُر پیچ، خم دار اور انتہائی دشوار راستہ اس انداز سے عبور کر جائے کہ وہ اکابر کے لیے بھی رشک بن جائے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کی انفرادیت ویکتائی کے لیے کافی ہے۔ کوئی اگر اپنی زندگی میں کچھ نہ کرے صرف تصنیف وتالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں اور علمی و تحقیقی مآثر وخدمات کے دوش بدوش اتنا کام کر جائے کہ کثرتِ نگارش کے تعلق سے وہ اپنی جماعت کے گنے چنے خوش نصیبوں میں شمار ہونے لگے، کثرت تصنیف کے تناظر میں اگر کوئی اسے اپنے دور کا "حیوانِ کاتب" کہے تو اِس کہنے والے پر مبالغہ آرائی ورنگ آمیزی کی تہمت ہرگز نہ لگے تو صرف یہ ایک بات ہی اس کے ممتاز ونمایاں ہونے کے لیے کافی ہے؛ لیکن اگر کسی شخص میں مذکورہ بالا سبھی اوصاف جمع ہو جائیں تو اس کی عظمت وعبقریت کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسے لفظوں کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا، اس کو کسی لفظی تعبیر کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سچ ہے کہ قسام ازل نے والد محترمؒ میں عظمت وعبقریت اور کمال وامتیاز کے مذکورہ عناصر کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے دیگر اور بہت سے عناصر جمع فرما دیے تھے، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

تربیت

والد محترمؒ کی شخصیت کے تناظر میں یہ باب مختلف الجہات اور کثیر شاخوں والا ہے جسے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں، اولاد کی تربیت کے باب میں آپ کتنے فکر مند واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ دورۂ حدیث شریف میں سنن ترمذی اور صحیح بخاری کی عبارت خوانی (جسے عام طور سے روا روی کی ایک چیز گردانا جاتا ہے) کے لیے بھی والد صاحبؒ طلبہ کی تربیت فرماتے تھے، ہر کہ ومہ کو ان کے گھنٹے میں عبارت خوانی کا شرف حاصل نہ ہوتا تھا، پہلے عبارت خوانی کا طریقہ صحتِ اعراب اور رفتار سے لے کر انداز تک

بتایا جاتا، اس کی روشنی میں خواہش مند طلبہ اپنا نام لکھواتے، پھر ان طلبہ کا اپنی بیٹھک میں ٹیسٹ لیتے، جو نہ چلنے والے ہوتے ان کا نام وہیں کٹ جاتا، جو چلنے والے ہوتے اور ان میں کچھ خامیاں دیکھتے تو اس کی نشاندہی کرکے اسے دور کرنے کی تلقین فرماتے، اس ٹیسٹ کو پاس کرنے والے طلبہ کے نام ایک کاغذ میں لکھے جاتے، پھر یہ فہرست ترجمان کو سونپی جاتی تھی، سونپے جانے کا مطلب یہ نہیں تھا اب ان طلبہ کا نام اس فہرست سے نکل نہیں سکتا، نہیں! پورے سال ان طلبہ کی نگرانی فرماتے، عبارت خوانی کے دوران نحوی، صرفی اور تجویدی غلطیوں کی صورت میں یا طے کردہ معیار سے اِدھر اُدھر نکل جانے کی صورت میں نام کبھی بھی اس فہرست سے نکال دیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو شخص عبارت خوانی جیسی غیر اہم سمجھی جانے والی چیز میں تربیت کا اتنا اہتمام کرتا تھا وہ اپنی اولاد کی تربیت جیسے اہم کام میں کہاں تک فکر مند رہتا ہوگا! یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کی دینی و دنیوی ہر دو اعتبار سے تربیت میں تا بہ زیست کوشاں رہے اور اس تعلیم و تربیت کے باب میں انھوں نے اپنی سرفروشانہ کوششوں اور جاں سوز جہد و جہد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس حوالے سے ان کے بہت سے واقعات مل جائیں گے، ان کی وفات کے بعد سوشل میڈیا پر آنے والے تعزیتی مضامین میں بھی بہتوں نے لکھے ہیں، ایک دو مجھ سے بھی سن لیجیے!

مدرسی کے زمانے میں میرا امتحان

عصر بعد کی کوئی مجلس تھی، یہ خامہ بردار بھی اس میں موجود تھا، مجلس میں سوال کرنے والا کوئی نہ تھا، قبرستان کا سا سناٹا، اس قسم کا سناٹا ہم جیسوں کے لیے بڑی آزمائش اور امتحان کی گھڑیاں لاتا کہ عام طور سے اس کے بعد والد صاحب کی طرف سے سوال آتا جو کہ خاصا مشکل ہوتا تھا۔ پوچھا: کون کونسی کتاب پڑھاتے ہو؟ کتابوں کے نام بتائے جن میں ایک نام شرح عقائد نسفی کا بھی تھا، پوچھا: شرح عقائد کتنی ہوئی؟ عرض کیا: اتنے صفحے! چند سیکنڈ خاموش رہے، اس کے بعد شرح عقائد کے ان صفحات میں سے جو پڑھائے جا چکے تھے کوئی عبارت زبانی پڑھی اور پوچھا کہ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟ اللہ اکبر کبیرا، یہ سطور لکھتے وقت اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ان کا رعب اتنا ہوتا تھا کہ آج کے پڑھائے ہوئے سبق میں سے اگر وہ کسی عبارت کے بارے میں سوال کرتے تو زبان تالو سے جا چپکتی، چہ جائیکہ ہفتے اور مہینے پہلے پڑھائے ہوئے سبق۔

افاداتِ اکابر

اشرف المجالس

ترتیب وپیش کش: مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی*

مخدومنا ومحبوبنا حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی ہر جمعہ بعد نمازِ عصر ہفتہ واری اصلاحی مجلس میں حکیم الامت مجددُ الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات کچھ توضیح وتشریح کے ساتھ تعلیم فرماتے ہیں، اُن ملفوظات کو قارئینِ اشرف الجرائد وعامۂ مسلمین کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ از مرتب

(۶۴) اصلاح فکرِ اصلاح سے ہوتی ہے۔

ارشاد فرمایا:۔ حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے: فرماتے ہیں کہ ''جو شخص اپنی اصلاح کی طرف خود توجہ نہ کرے ان کی اصلاح بزرگ سے تو کیا نبی سے بھی نہیں ہوسکتی، دیکھئے ابو طالب باوجود یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے مخالف نہ تھے بل کہ اُسے حق سمجھتے تھے پھر بھی چوں کہ اہمیت نہ دی، ایمان لانے کی فکر نہ کی تو ان کو بھی ہدایت نہ ہوئی، انہوں نے ایمان کی طرف توجہ نہیں کی انھیں خود سے فکر نہیں تھی کہ وہ ایمان والے ہو جائیں، حالاں کہ حضور علیہ السلام نے اخیر تک خیر خواہی فرمائی، دعوت دیتے رہے مگر پھر بھی آخری جواب یہی دے دیا کہ **انا علی ملة عبد المطلب** میں عبد المطلب کے دین پر مر رہا ہوں، اور عبد المطلب کا دین اسلام نہیں تھا، لوگوں نے ابو طالب کو بار بار عار دلائی تھی کہ کیا آپ اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیں گے؟ اِدھر حضور علیہ السلام کہتے رہے: ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیجیے، میں قیامت کے دن گواہی دوں گا، لیکن انہوں نے قوم کی رعایت کرتے ہوئے کلمہ نہیں پڑھا، باوجود یہ کہ بھتیجے کو حق پر سمجھتے تھے، یہی نہیں عمر بھر اُن کی مدد بھی کرتے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی کا سامان بنے رہے، حق کے لیے سب کچھ کیا؛ لیکن خود حق کو اختیار نہیں کیا، اسی لئے فرمایا: ''جو شخص اپنی اصلاح کی طرف خود توجہ نہ کرے اس کی اصلاح بزرگ سے تو کیا نبی سے بھی نہیں ہوسکتی''، کتنے لوگ مدینے میں منافق تھے، کیوں تھے؟ اسی لیے تھے کہ وہ خود طالبِ اصلاح نہیں تھے، وہ حضور سے کچھ سیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے، جب نہیں چاہتے تھے تو امام الانبیاء کی صحبت میں رہ کر محروم رہے، حضرت فرماتے ہیں ''اور اگر توجہ

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

اورخواست گاری ہو، یعنی طلب ہوتو بزرگ تو بڑی چیز ہے جانوروں سے بھی اصلاح ہو جاتی ہے''، یعنی آدمی کو کہیں سے بھی اللہ تعالیٰ راستہ دکھا دیتا ہے، کب؟ جب کہ اپنے اندر خواست گاری یعنی طلبِ صادق اور توجہ وفکر ہو کہ میری اصلاح ہو جائے، میرے اندر کی کمیاں دور ہو جائیں، اپنے اندر جو کمیاں ہیں اپنے سے زیادہ کون جانتا ہے؟ ہم ہی تو جانتے ہیں تو ان کی اصلاح کی فکر ہونی چاہیے، ان کی فکر پیدا ہوگی تو ضرور اصلاح کے راستے کھلیں گے، جس کو فکر ہوتی ہے وہ کوشش کرتا ہے، سعی کرتا ہے، یعنی اس کے جو صحیح اسباب ہیں، وہ اختیار کرتا ہے، اور جب اختیار کرتا ہے تو پھر وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ کا وعدہ پورا ہوتا ہے۔

(۶۵) ابوطالب کے بارے میں اہلِ سنت کا موقف

ارشاد فرمایا: ابوطالب کے بارے میں بات آئی تو یہ بتا دیں کہ ابوطالب کے بارے میں اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک تحقیق یہی ہے کہ انہوں نے دینِ اسلام کو قبول نہیں کیا، اور وہ اپنے آباؤ واجداد کی ملت پہ مرے ہیں، دین کی دعوت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر کوئی صراحتاً قبول نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا حضور علیہ السلام نبوت کے بعد تقریباً دس سال ان کے ساتھ رہے، اور آخر میں تو گھر میں جا کر باقاعدہ دعوت اور برابر ترغیب دیتے رہے، اپنی والی پوری کوشش کر لی؛ لیکن پھر بھی انہوں نے آخری بات یہی کہی کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں''، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دین انہوں نے قبول نہیں کیا، اس لئے اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک ان کا انتقال کفر پر ہی ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو ان کے بارے میں دعائے مغفرت کرنے سے بھی منع فرما دیا تھا، ان کے علاوہ کسی بھی کافر ومشرک کے بارے میں دعائے مغفرت کرنے سے منع فرما دیا، البتہ اہلِ سنت والجماعت ابوطالب کی بے احترامی نہیں کرتے، ان کے لیے بے ادبی و بے تہذیبی کے الفاظ بھی استعمال نہیں کرتے، اس لیے نہیں کرتے کہ انہوں نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام کیا ہے، عملاً بھی شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آئے، بس ہم بھی اس کا لحاظ کرتے ہیں، ان کے بارے میں ایسا لب ولہجہ اختیار نہیں کرتے جیسا کہ ابولہب اور ابوجہل کے بارے میں کرتے ہیں، ایمان نہ لانے میں تو تینوں قدرِ مشترک ہیں، لیکن تینوں میں ایک آپ کے ساتھ ایذاء رسانی کا معاملہ نہیں کرتے تھے، باقی دونوں بدتمیزی کے ساتھ تکلیف بھی دیتے تھے، اور ایذا رسانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، اسلام کی راہ میں رکاوٹ بھی بنتے تھے، ابوطالب نے ایسا نہیں کیا بل کہ آپ کی حمایت وحفاظت کی، اس لیے ان کی بے احترامی کا کوئی معاملہ ہم نہیں کرتے ہیں، باقی یہ کہ ان کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں ایسا نہیں ہے، ہاں! روافض ان کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

افاداتِ اکابر

ارشاد السالکین

"خانقاہِ سعیدیہ" میں ہر شمسی مہینے کے دوسرے اتوار کو صبح ۹/ بجے تا شب ۹/ بجے اصلاحی مجلس منعقد ہوتی ہے، اس میں جنوبی ہند کی تمام ہی ریاستوں سے تقریباً تین سو سالکین شرکت کرتے ہیں، صبح ۱۰ تا ۱۲/ بجے کی نشست میں شرکاء کے پوچھے گئے سوالات کے جواب مرشدی حضرت اقدس مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہٗ العالی خود دیتے ہیں، جو بہت ہی نافع ہوتے ہیں، علماء وعوام سب ہی اس کے قائل ہیں، اس لئے مولانا مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی زید فضلہٗ استاذ ادارۂ ہذا و مجازِ حضرت والا نے اِن کو جمع کر کے قارئین کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ از مرتب

سرپرست لوگ اصلاح کی کوششوں میں رکاوٹ بنتے ہیں

سوال (۱۰۰): ۔اللہ پاک کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرتِ والا کی محبت ومعیت نصیب ہے، جب کہ دین کے نام پر مختلف غلط قسم کے افکار ونظریات میں اکثر لوگ ملوث ہیں، ہمارے والد صاحب تبلیغی ذہن کے آدمی ہیں، وہ سالانہ چلہ وغیرہ کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ نماز پڑھو، گشت کرلو، ذکر کرو، قرآن پڑھو، اس لئے کہ میں حافظ ہوں، اور حضرت والا کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، جبکہ میرا خیال یہ ہے کہ آپ سے میں آخری سانس تک جڑا رہوں، فائدہ ہوتا ہے، چوں کہ وہ پورے دین کا علم نہیں رکھتے ہیں، میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب: جو لوگ بھی دعوت وتبلیغ میں لگے ہوئے ہیں وہ لوگ مخلص تو ہیں، انہیں دین کی فکر بھی ہے، جتنا دین معلوم ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں، وضع قطع بھی اکثر لوگوں کی مسنون ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ دین کی صحیح معرفت ان کو نہیں ہے نہ ہی اُن کے بڑے انہیں پورے دین کے بارے میں بتاتے ہیں، اس وجہ سے ان لوگوں کو اس قسم کے خیالات آتے ہیں، اور ایسا مشورہ دیتے ہیں، بہرحال وہ والد ہیں، ان کا احترام اور عزت و خدمت کرتے ہوئے اپنی آخرت کی کامیابی اور اصلاحِ حال کی فکر کا خود فیصلہ کرو، اور اس پر عمل کرو۔

اپنے شیخ سے دوسرے شیوخ کی نصیحتوں کا مطالبہ بے تہذیبی کی بات ہے

سوال (۱۰۱):۔ میں حضرت مفتی سعید احمد پرنام بٹی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متأثر ہوں، ان کی کوئی نصیحت جو آپ کو ذہن میں ہو عرض کریں؛ تاکہ میرا اور سالکین کا فائدہ ہو۔

جواب:۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آپ متأثر ہیں؛ ماشاء اللہ وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب آپ کس سے متاثر ہیں، اب آپ کا سوفی صد تأثر اپنے پیر سے ہونا چاہیے، آپ مجھ سے مطالبہ کررہے ہیں کہ کسی اور کی نصیحت ہم کو کیجئے، اگرچہ وہ میرے شیخ و مُربی ہیں میں کبھی اُن سے ایسا تقاضا نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اپنے شیخ سے وافر عقیدت نہیں ہے، اگر ہوتی تو آپ کو ایسا خیال بھی نہ آتا، جہاں تک حضرت کی نصیحتوں کا معاملہ ہے تو میں نے خود جمع کی ہیں، چھپی ہوئی ہیں، وہ ملفوظات و نصائح پڑھتے رہو، عمل کرتے رہو، اگر آپ کو ایسا خیال آتا ہے کہ آپ خود کچھ سنانے کے بجائے کسی اور کا سنایئے، زیادہ فائدہ ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مصلح ہیں، اور ہم آپ کے تابع ہیں کہ آپ کے مشوروں سے ہم کام کریں، اس قسم کے مطالبے بے تہذیبی کی باتیں ہیں، یہ سب سلوک میں نہیں چلتا، سلوک میں ایک ہی ہستی سامنے ہوتی ہے اور اس سے نظر نہیں ہٹتی، تب ہی جاکے سالک کسی مقام پر پہنچ پاتا ہے۔

تبلیغی حضرات کو سمجھائیں

سوال (۱۰۲): حضرت! تبلیغی حضرات کو پورا دین سیکھنا ضروری ہے، کیسے سمجھائیں؟ راہنمائی فرمائیں۔

جواب: کبھی کبھی مناسب عنوان سے بتادیا جائے، باقی ان کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ لوگ کسی کو عالم نہیں مانتے، علماء کو بھی وہی سکھانا چاہتے ہیں جو انہوں نے سیکھا ہوا ہے۔ اپنے مرکز سے آئی ہوئی بات کے علاوہ نہ کسی اور کی طرف دیکھتے ہیں، نہ کسی کی سنتے ہیں؛ اس لئے اگر اسی مرکز سے اُن کو پورا دین بتایا جائے تو بہت کچھ فائدہ کی اُمید ہے، باقی ہمارے بولنے سے کچھ ہونے والا نہیں، دعا کرو، اتنا تو کرسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمادے، دین کی صحیح سمجھ بڑی چیز ہے؛ اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو سب سے بڑی دعا دی، یعنی اے اللہ! ابن عباس رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید کا علم عطا کیجیے، اور دین کی سمجھ عطا کیجئے، تو دین کی سمجھ بہت بڑی چیز ہے، جب کسی بھی چیز میں آدمی عصبیتِ جاہلیہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ترقی ختم ہو جاتی ہے، اور وہ دن بدن گمراہی کی طرف بڑھتا ہے، ہدایت کی طرف نہیں۔

مطالعہ کی میز پر

نقد و تبصرہ

نام کتاب: سونے کی تجارت کے جدید مسائل

مصنف: مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی صاحب زید مجدہٗ

مبصر: مفتی احسان احمد صدیقی صاحب قاسمی زید فضلہٗ (استاذ فقہ وافتاء ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد)

ناشر: مکتبہ فاروق

صفحات: 180 قیمت: -/250

ملنے کا پتہ: دارالعلوم رشیدیہ، مہدی پٹنم حیدرآباد

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

سونا اور چاندی کو اللہ تعالیٰ نے ثمن خلقی بنایا ہے، زمانہ قدیم سے ان دھاتوں کی اہمیت مسلم رہی ہے، زرِ مبادلہ کے طور پر اس کا استعمال روساء و امراء کی امتیازی شان رہتی ہے، زمانہ کے اس قدر پیچ وخم اور تغیر و تبدل کے باوجود آج بھی اس کی ثمنیت مسلم ہے، ثمن اصطلاحی یعنی موجودہ کرنسی کے غیر معمولی چلن اور اس کے رواج کے باوجود بھی اور سرمایہ کاری کے ان گنت میادین کے باوجود بھی سونا چاندی میں سرمایہ کاری اور اپنے مال و دولت کو اس شکل میں محفوظ کرنا ایک محفوظ سرمایہ کاری شمار ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کی سب سے قیمتی دھات اور عالم کی سب سے اہم ترین سرمایہ کاری اپنے وجود کے لئے جدید زمانہ میں جدید ترین شکلوں کی متقاضی ہوگی، ماضی قریب تک خیال کیا جاتا تھا کہ سونا چاندی خریدنا صرف سلاطین و امراء کا کام ہے لیکن موجودہ زمانہ کی فلک بوس گرانی اور ہمارے ملک کی زمین بوس معیشت کے باوجود بھی سونے کے تجار کی جانب سے پیش کی جانے والی نت نئی اسکیموں نے غرباء کو بھی سونے کا خریدار بنا دیا جس کی وجہ سے سونے چاندی کی خرید وفروخت اور اس کی تجارت میں جدید مسائل کا ایک باب کھل گیا، علماء ومفتیان کرام ان جدید مسائل پر موقع بہ موقع راہنمائی کرتے رہتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

بحمد اللہ زیر تبصرہ کتاب "سونے کی تجارت کے جدید مسائل" کا چیدہ چیدہ مطالعہ کا موقع ملا، ماشاء اللہ سونے کی تجارت سے متعلق بکھرے مسائل کو ایک لڑی میں پرو کر محترم مولانا مفتی احمد اللہ نثار صاحب زید مجدہٗ نے بڑا قیمتی اور مفید ہار تیار کر دیا، خصوصاً وہ مسائل جن کی جدت نے انہیں متداول کتابوں میں جگہ فراہم نہیں کی اور مختلف تحقیقی مقالات یا سیمیناروں کے تجاویز کی شکل میں موجود تھے۔ مولانا نے اپنے علمی ذوق اور تحقیقی مزاج سے انہیں سلیقہ سے ملخص، مرتب اور منظم کیا، سونے کی تاریخ سے لے کر جدید دور کی رائج اسکیموں تک نہایت مفصل اور چشم کشا تحقیق پیش کی عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی مصنف جدید مسائل پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اگلے زمانہ کی دوڑ میں پچھلے حالات و کیفیات، سیرت و سنت، صحابہؓ و تابعینؒ کے واقعات سے تخلف کر جاتا ہے، لیکن محترم موصوف مؤلف نے عہد نبوی کے بھی واقعات و احوال کو کتاب میں بالتفصیل جگہ دی، نیز دور حاضر میں سونے اور چاندی میں پیسہ انوسٹ کرنے کی سنہری جال کا بھی پردہ چاک کیا اور اس طرح کے فراڈ کی کئی مثالیں پیش کر کے حکم شرعی سے بلکہ آگے بڑھ کر مفید مشوروں سے بھی اس کتاب کو مزین کیا ہے، ایسے ہی فاریکس ٹریڈنگ جیسی دن بدن بدلتی تجارتی دنیاء کیلئے شرعی اصول وضوابط پیش کر کے ہر زمانہ کیلئے اس نوع کے مسائل کو حل کرنے کی سعی جمیل فرمائی، ان تمام مسائل شرعیہ کے ساتھ مسلم دورِ حکمرانی میں معاشی استحکام رعایا کی خوش حالی اور سونے کی ریل پیل کی بھی بہترین عکاسی کرتے ہوئے متعصب طبقہ کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔

الغرض یہ اپنے موضوع پر نہایت مفید و جامع کتاب ہے، اللہ سے دعاء ہے کہ اس کتاب کو خوب نافع بنائے اور مجھے بھی مزید استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔

نوٹ: اس کتاب کے حصول کو ناشرین ومرتبین نے سہل بنایا ہے، طلبہ وعلماء اور اہلِ مدارس کے لیے 50% فیصد خصوصی رعایت رکھی گئی ہے۔ تاجر حضرات تاجرانہ معاملت ومنفعت کے لئے مولانا طیب صاحب سے اس نمبر 8341658711 پر رابطہ کریں۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

مکان کی دیوار اور دروازے پر قرآن پاک کی آیات لکھنے کا حکم

سوال: (۱) گھر کی دیواروں یا دروازے یا مین گیٹ پر قرآن پاک کی آیات لکھنا پینٹ سے، یا پتھر پر کندہ کرانا کیا جائز ہے؟ (۲) کیا کوئی آدمی اپنے نام والی آیت؛ پتھر میں کندہ کروا کر اپنے مین گیٹ کی دیوار میں جس کی اونچائی نصف قد یا تھوڑی سی کم ہو لگا سکتا ہے یا نہیں؟ آیت کی مثال: إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ (النمل: ۳۰)

جواب (۱) گھر کی دیواروں یا دروازے یا مین گیٹ پر قرآن پاک کی آیات لکھنے، یا پتھر پر کندہ کرانے میں اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ وہ جگہ ٹوٹ کر گر جائے، اور قرآنی آیات روندی جائیں؛ اس لیے فقہاء نے اس کو خلافِ ادب اور مکروہ لکھا ہے۔ (۲) اپنے نام والی آیت پتھر میں کندہ کروا کر اپنے مین گیٹ کی دیوار وغیرہ میں لگانے میں قرآن کو غیرِ موضعِ لہٗ میں (بے جا) استعمال کرنا پایا جائے گا؛ اس لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۳۴)

جب ہدایت اور گمراہی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو بندوں کو عذاب کیوں؟

سوال: قرآن کہتا ہے کہ اللہ جس کو چاہے گمراہ کرتا ہے، اور جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے، تو پھر جب انسان کو گمراہ اللہ ہی کرتا ہے، تو پھر اس کو سزا اور دوزخ کا عذاب کیوں؟

جواب: اللہ ہی گمراہ کرتا ہے، اور اللہ ہی ہدایت دیتا ہے؛ لیکن بندہ اس میں مجبورِ محض نہیں ہے؛ بلکہ اللہ نے دونوں راستے دکھا دیے، اچھائی اور برائی کا راستہ بتلانے کے لیے انبیاء بھیجے، اور کتابیں نازل کیں؛ تاکہ جو چاہے اپنے اختیار سے سیدھا راستہ اپنائے، اور جو چاہے غلط راستے پر چلے، یہ بات بار بار قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیے ہیں، اب اگر کوئی سیدھا راستہ اختیار نہ کرے، تو اس کا وبال اسی

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کے سر ہے۔(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۸۶)

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال: میں نے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز نہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لیں تو گناہ تو نہیں ہے؟

جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں حرج نہیں؛ البتہ دعا کرتے وقت رخ قبلے کی طرف کرے، نہ کہ قبر کی طرف؛ تاکہ استمداد کا شبہ نہ ہو، اور لوگوں کے عقیدے کی خرابی کا سبب نہ بنے۔

(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۱۰۴)

وضو کے بعد آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کیا پڑھے؟

سوال: وضو کے بعد آسمان کی جانب انگلی اٹھانا کیسا ہے؟ اور کیا پڑھیں؟

جواب: وضو کے بعد آسمان کی جانب نظر اٹھا کر کلمۂ شہادت اور دعا پڑھنا ثابت ہے، البتہ انگلی اٹھانا کسی روایت میں صراحۃ نظر سے نہیں گذرا، لیکن فقہائے کرام نے اسے مستحسن قرار دیا ہے، مگر اسے ضروری یا سنت نہ سمجھا جائے۔(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۱۱۶)

عورتیں اول وقت میں نماز ادا کریں یا آخرِ وقت میں؟

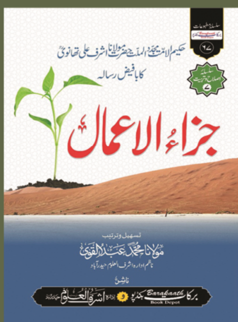
سوال: عورتوں کے لئے اول وقت میں نماز پڑھنا بہتر ہے یا آخر وقت میں؟

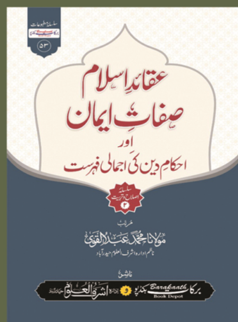
جواب: عورتوں کے لئے فجر کی نماز وقت شروع ہوجانے کے بعد اولِ وقت میں پڑھنا مستحب ہے اور فجر کے علاوہ دیگر نمازوں میں جب مسجد کی جماعت ہوجائے، تب عورتیں اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، افضل یہی ہے۔(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۱۳۴)

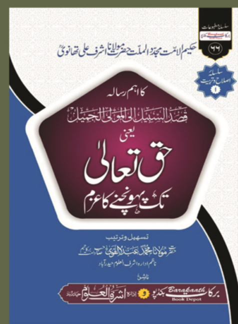
موبائل کالز ریکارڈ کرنے کا حکم

سوال: موبائل کالز ریکارڈ کرنا کیسا ہے؟

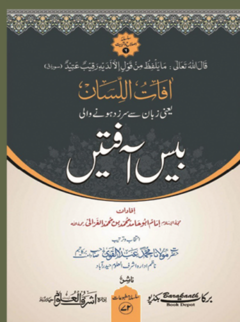
جواب: آپس میں جو بات چیت ہوتی ہے وہ امانت، اس لئے بلا اجازت آنے جانے والی کال کر ریکارڈ کرنا درست نہیں؛ **لان المجالس بالامانة**، اور کال ریکارڈ کر کے اس کو عام کرنا صریح خیانت ہے، خاص طور پر جب ایسی بات ہو جو پوشیدہ رکھنے کی ہو اور بات کرنے والا مخاطب کو امین سمجھ کر اس سے اپنی دل کی بات کہہ رہا ہو۔(منتخب فتاوی دار العلوم دیوبند، ۱/ ۵۴۴)

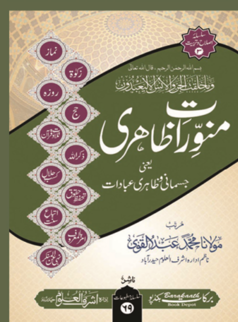


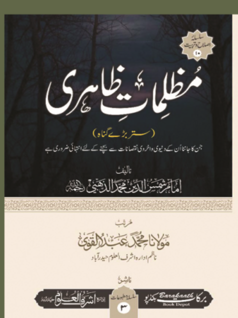


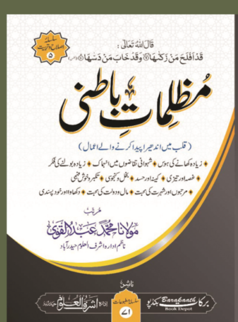


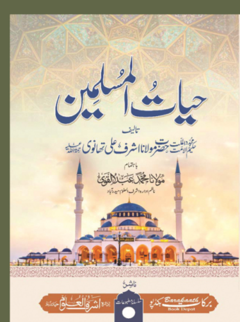












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi